P- 120

3219

فنونِ لطیفہ

جلد

اورنگ زیب

ایک لیکچر

3219

فنونِ لطیفہ بعہدِ اورنگزیب

از

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

سنہ ۱۹۵۷ء

کتاب خانہ نورس (کاپی بک شاپ) کیپر سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

A-4063

طبع اول ۱۹۵۵ء انشا پریس - لاہور میں چھپا تعداد: ۵۰۰

قیمت دو روپے

DEPARTMENT OF FINE ARTS
LIBRARY
PUNJAB UNIVERSITY

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	مقدمہ	۵
۲	اورنگ زیب عالمگیر کی تاجپوشی	۸
۳	اسلامی تعمیرات	۱۴
۴	بناء حصار دولت آثار الخ	۱۶
۵	بناء مسجد فیض اساس الخ	۱۸
۶	دہلی	۲۲
۷	متھرا	۲۶
۸	حصار	۲۶
۹	لاہور	۲۶
۱۰	کشمیر	۳۲
۱۱	احمد آباد	۳۳
۱۲	وسط ہند	۳۳
۱۳	گوالیار	۳۵
۱۴	دکن	۳۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵	گلبرگہ	۳۹
۱۶	بنگال	۳۹
۱۷	پٹنہ	۴۰
۱۸	تاج بعہد اورنگ زیب	۴۱
۱۹	غیر اسلامی عمارات	۴۴
۲۰	فرمان عالمگیر	۴۵
۲۱	مصوری	۵۶
۲۲	اورنگ زیب کی ذاتی تصاویر	۵۹
۲۳	یورپین محققین کی رائے	۶۴
۲۴	مغل حرم کی عمارات کی تصاویر	۶۶
۲۵	مصوری کا سیاسی مصرف	۶۶
۲۶	شبیہات	۶۷
۲۷	دیواروں پر تصاویر مٹانے کا انتظام	۶۸
۲۸	ہندو مصوری	۷۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۹	اورنگ زیب کے عہد کے بعض مشہور مصور	۷۲
۳۰	خطاطی	۷۵
۳۱	تعلیم کتابت	۷۶
۳۲	اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن کریم	۷۷
۳۳	دیگر خطاط	۷۹
۳۴	خط کے اقسام۔ خط دیوانی	۸۴
۳۵	خط شفیعا شکستہ	۸۵
۳۶	خط شکستہ	۸۷
۳۷	کفایت خاں	۸۸
۳۸	کفایت خانی	۸۹
۳۹	درایت خانی	۹۰
۴۰	موسیقی	۹۲
۴۱	جنگ فیلاں	۹۷
۴۲	رزم آوری اورنگ زیب با فیل	۹۹
۴۳	آلاتِ حرب	۱۰۳
۴۴	سکہ جات	۱۰۷
۴۵	چینی کوزہ گری	۱۱۲
۴۶	کارخانہ جات	۱۱۳
۴۷	متعلق کپڑا	۱۱۳
۴۸	کارخانہ قالین سازی	۱۱۶
۴۹	کارخانہ جہاز	۱۱۶
۵۰	میلے یا مینا بازار	۱۱۷
۵۱	کھانوں کے متعلق	۱۱۹
۵۲	نتیجہ	۱۲۰

مُقدّمہ

یہ مقالہ جو بعنوان "اورنگ زیب کے عہد میں فنون لطیفہ" بصورتِ ایک کتاب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے دراصل اس کی ابتدا اسی عنوان سے ایک لیکچر یا تقریر سے ۱۹۳۱ء میں تحریک ہوئی تھی۔ جب کہ راقم حیدرآباد دکن میں کچھ عرصہ کے لئے مقیم تھا۔ اور یہ چند احباب کی درخواست پر طے پاچکا تھا کہ یہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی بزم تاریخ کے سامنے پڑھا جائیگا۔ مگر ایک دم مجھے وہاں سے لاہور ایک ضروری کام سے واپس آنا پڑا اور اس لیکچر کو طلباء عثمانیہ یونیورسٹی کے سامنے پیش کرنے کا موقع ہی نہیں آیا۔ مگر ویسے یہ موضوع اس قدر دلچسپ اور اہم نظر آیا کہ فنون لطیفہ اور عام فنون کو اس عہد میں بالاستیعاب دیکھنا پڑا۔ اور آخر کار یہ تمام مواد ایک کتاب کی صورت اختیار کر گیا۔ دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے یہ موضوع اس لئے بھی ضروری معلوم ہوا کہ وہاں عام طور پر اورنگ زیب کو حملہ آور دکن کی زندگی میں ایک خاص تبدیلی پیدا کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ جو خاص کر مذہبی ماحول میں بصورت اہل سنت پیش آئی۔ کیونکہ اس سے پیشتر دکن میں عام طور اثنا عشریہ ماحول تھا۔ اورنگ زیب نے اس ملک میں ہمہ تن چھبیس سال برسرِ جنگ رہنے کے باعث اس کو 'دار الجہاد' قرار دیا۔ جو اس کے سکوں اور اوراق تاریخ سے بھی بخوبی واضح ہے۔ بقول صاحب منتخب اللباب (ص ۲۵۵ ج ۲) اورنگ زیب دکن کی مہم کے لئے بعد نماز عید الفطر ۱۰۹۲ھ روانہ ہوا۔ چونکہ ۱۹۴۷ء سے ہندوستان میں تقسیم کے بعد حیدرآباد میں وہ تبدیلی آچکی ہے جس کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں تھا یعنی ہم جو آج آصف جاہیہ خاندان کے جانشین آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں جن کی علمی فیاضیوں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے باعث خسرو دکن سلطان العلوم کے نام سے [illegible] کی مدت بھی کی ہے۔

یاد کرتے تھے اور دکن اورنگ زیب کے دارالجہاد سے دارالامن بن چکا تھا۔ جس میں اردو کو ذریعہ تعلیم قائم کرکے دنیا میں ایک طرۂ امتیاز حاصل کیا تھا۔ مگر وہ تمام ماحول اور روایات بصورت ہندی زبان تبدیل ہی نہیں ہوئیں بلکہ حیدرآباد کے تمام جغرافیائی و ثقافتی روایات و ماحول کو بھی مٹانے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ غرضیکہ یہ واقعات اس کتاب کو محفوظ کرنے کے بھی محرک ہیں۔ اس عہد کی فنی، ثقافتی تاریخی، ادبی ماحول اور روایات کو ہر طرح غنیمت سمجھ کر ایک مبسوط مقالہ بنام "تمدن ہند میں دکن کا حصہ" ۱۹۳۶ء میں انگریزی اور اردو میں پیش کیا گیا تھا۔ جو میر عثمان علی خاں کی سلور جوبلی کا سال تھا!

اورنگ زیب عالمگیر کا عہد حکومت ۱۰۶۸ھ سے لیکر ۱۱۱۸ھ کے سالوں پر حاوی ہے۔ اس دور کو عام طور پر اورنگ زیب کے ذاتی مذہبی رجحانات کی بنا پر یورپ کے دور پیوریٹن ازم (خالص مذہبیت) سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جو اورنگ زیب کے عہد سے ایک طرح معاصر ضرور تھا۔ مگر ان دونوں میں بہت فرق تھا۔ کیونکہ یورپ میں یہ تحریک عوام کے گروہ سے رونما پذیر ہوئی اور یہاں ایک شاہنشاہ کے ذاتی عمل سے وقوع میں آئی! یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تاریخی بہاؤ یا دھارا میلان تاریخ جسے انگریزی میں کرنٹ کہتے ہیں عام طور پر ایک ہی نوعیت سے دنیا میں اپنا عمل کیا کرتے ہیں۔ خواہ ان کا محرک یا اسباب و علل کچھ ہوں جیسا کہ ہم نے یورپ کی ہر دو عظیم جنگوں میں تجربہ کیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا برسر جنگ ہے۔ اور آج بھی یہی جذبہ ملک گیری ہر سلطنت کا اولیں شیوہ ہو گیا ہے۔ غرضیکہ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ جن میں مختلف انواع میلان طبع مختلف اوقات میں رونما پذیر ہوئی ہیں مگر جب ہم سیاسی ماحول سے ہٹ کر ذہنی و ذاتی اعتبار سے دیکھتے ہیں جسے صحیح معنوں میں آرٹ (فن) کہنا چاہئے۔ تو اس ضمن میں بھی مشرقی و مغربی طبعاً بالکل الگ الگ نظر آتے ہیں کیونکہ عام طور پر مشرقی ماہرین فن کے فروغ و ترقی کا انحصار ہی نہیں بلکہ ان کی ذاتی بود و باش کا بھی جہاں تک تعلق ہے ہمیشہ خلفاء اسلام، امراء، بادشاہوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی پر موقوف رہا ہے۔ جس میں البتہ عہد

اورنگ زیب میں سب سے بڑی خاص تبدیلی یہ ہوئی کہ اس نے تمام روایات مشرق کو بدل دیا۔ یعنی فنی سرپرستی اور حوصلہ افزائی دربار کی طرف سے موقوف ہو گئی بلکہ ایک طرح فنون کو ان قیود سے آزاد کر دیا یعنی فنون اپنے امیرانہ ماحول یا آمریت سے نکل کر جمہوریت یا شخصی آزادانہ کا ناموں میں رو پذیر ہونے شروع ہو گئے۔ جسے ایک خاص ذہنی خود مختاری سے تعبیر کرنا چاہیئے جس سے کئی شخصی مقامی دبستان فنون پیدا ہوئے۔ اور ماہرین نے بھی ان کو مختلف طریق سے نہایت آزادانہ طور پر تنقید کی کسوٹی پر تعبیر و پرکھنا شروع کیا۔ جو ملوکیت کے دور میں حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ فنون لطیفہ اور عام علم و ہنر پرستی کے نظریہ کو مدنظر رکھ کر مجموعی حیثیت سے ذیل کے صفحات میں تبصرہ کیا گیا ہے

قارئین کرام سے ایک درخواست ہے کہ اس اعتقاد کو دل سے نکال کر راقم کی اس علمی کوشش کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کہ اورنگ زیب فنون لطیفہ کے فہم و ادراک سے عاری تھا۔ بلکہ اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کہ اس نے محض ایک عام فرد کی حیثیت سے کس قدر علوم و فنون کی طرف توجہ کی۔ اگر ہم اورنگ زیب کو ایک مجاہد یا سپاہی ہی تصور کرتے ہیں تو اسی نظریہ کو مدنظر رکھ کر ہمیں دوسرے ایسے مجاہدین جن میں صلاح الدین ایوبی۔ قتیبہ بن مسلم، امیر تیمور، سلطان محمد ثانی، اتاترک وغیرہ شامل ہیں۔ ہمیں ان کی زندگی اور ان کے مابعد کے نتائج کو ذہن سے محو نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی ضمن میں اورنگ زیب کا اپنا ذاتی ایک رقعہ بنام فرزند خود ملاحظہ فرمایئے۔

فرزند عالیجاہ:- فقیرے حدیثے نوشتہ آوردہ کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم از مہتر جبریل علیہ السلام پرسیدند کہ کدام عمل بہترین اعمال است۔ گفت خدمت ملوک کہ نفع و سرور باہل حاجت رساند من خواہم کہ در خدمت ملوک باشم و قضای حاجت مسلمان میکردہ باشم فرمودیم کہ نقصان نیست۔

اورنگ زیب عالمگیر

عالمگیر کے اس رقعہ کو میں نے اس کے الفاظ سے اس لیکچر کا مقدمہ قرار دیا تھا جو اس موضوع کے لئے موزوں تھا۔ لفظ نفع سے میرے محکمہ اخبار خیر اور سرور سے جمالیات مراد لئے ہیں۔

اورنگزیب عالمگیر کی تاجپوشی

جب اورنگ زیب نے دیکھا کہ شجاع، مراد اور دارا ہر سہ بادشاہ بننے کے پورے پورے منصوبے بنا چکے ہیں جو مراد اور شجاع کے سکوں سے ظاہر ہے دارا اور شاہجہاں کی اپنی چالوں سے ظاہر ہے کہ تخت دارا کے لئے طے پا چکا تھا۔ ساتھ ہی اورنگ زیب نے اپنی بہادری سے ان کو کسی حد تک مختلف جنگوں میں پسپا بھی کر دیا تھا۔ پھر اسے خوب واضح ہو چکا تھا کہ یہ سب کیا کیا ارادے رکھتے ہیں، اور کس کس قابلیت کے مالک ہیں۔ چنانچہ اول ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ میں جب کہ دارا نے بھاگ کر لاہور میں شاہی خزانہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مراد کو احتیاطاً گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اور شجاع بنگال سے اراکان وغیرہ کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ یہ سب دیکھ کر اورنگ زیب نے دہلی کے قریب اغرآباد کے باغ شالامار میں خیمہ لگایا۔ اور بغیر قلعہ دہلی میں داخل ہوئے اسی باغ میں بعد ادا کرنے نماز تخت شاہنشاہیت ہند پر جلوہ فروز ہوا۔ اصلی رسومات تخت نشینی کو دوسرے موقع کے لئے ملتوی کر دیا۔

بعض حضرات نے جنگ تخت نشینی کو جنگ کفر و اسلام کہا ہے۔ یعنی اورنگ زیب نے اپنی تمام قوت دارا جوان کے نزدیک کافر تھا مٹانے کی کوشش کر دی تھی اور دوسرے بھائیوں کے خلاف جنگ بھی انہیں اصول پر تھا۔ سیاسی اعتبار سے یہ بات بعید ہے۔ یہ جنگ محض سیاسی اعتبار سے حصول تخت کے لئے تھی۔ یہ منجملہ بہت سے اسباب کے ایک سبب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اورنگ زیب نے خود شاہ عباس ثانی کو اس کے ایک خط کے جواب میں ان تمام جنگوں کو مختصراً بیان کیا ہے بلکہ

اورنگ زیب کے سامنے اس ضمن میں یہ آیہ کریمہ تھی جس کی رو سے اس سے مقابلہ وغیرہ کیا

فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون (سورۂ مومن)۔ الملک عقیمؑ یعنی ملک بانجھ ہے

اس کا ایک قابل آدمی بادشاہ ہو سکتا ہے۔ اگر کفر و اسلام کی جنگ ہوتی تو اورنگزیب کو چاہیے تھا کہ جس وقت دارا جو اس کے نزدیک کافر تھا کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ فوراً الگ ہو کر کنارہ کشی کرتا اور تخت کو دوسروں کے لئے چھوڑ دیتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں وہ معمولی تخت نشینی کراتا ہے۔ پھر دوسری باقاعدہ تخت نشینی کے لئے تیاریاں ہوتی ہیں اور پورے احتشام کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ جس میں تمام روایات شاہان مغل کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جو محض سیاسی اعتبار پر تھا۔ تاکہ دبدبہ شاہنشاہی بیٹھ جائے۔ چنانچہ مورخین نے اس تفصیل کو نہایت خوبی سے ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے جو بذات خود آرٹ کا ایک نمونہ ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ فن کا اظہار نہیں ہو سکتا:

"پہلا جلوس حسن ساعت کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ لیکن جیسا کہ صاحب اقتدار بادشاہوں کے آرائشی اور زیبائشی اور شان و شوکت کے بموجب وقتی مصلحت سے عمل میں نہیں آیا تھا۔ خطبہ، سکہ، تعین، لقب دوسری ساعت نیک پر ملتوی رکھا گیا تھا۔ کہ بھائیوں کی دشمنی سے طمانیت حاصل ہو جائے

چنانچہ اس بارے میں جب فتح اور فیروزمندی حاصل ہوئی تو شاہجہاں آباد کو جو دارالسلطنت تھا مراجعت ہوئی۔ اور اس مبارک ساعت کے لئے ہوشیار منجموں نے یوم چوبیس ماہ مبارک کو تعین کیا۔ احکام جاری کئے گئے کہ اس ساعت سعید پر جشن منائے جائیں۔ اور اس کی تعمیل میں محلوں کو سجایا گیا۔ شہروں کو رونق دی گئی۔ اسباب تجمل اور شوکت آرائشی و زیبائشی مہیا کئے گئے۔ تعمیل امر میں کارکنان دولت نے کوئی دقیقہ کوشش نہیں چھوڑا۔ اور بموجب حکم جالیس کھمبہ محل اور دیوان عام کو گلاب اور زربفت، مخمل اور گجراتی تالشی سے منڈھ کر دلفریب بنا دیا گیا[1]۔ مینا کاری ستارے اور مرصع مصنوعی ستارے جو اصلی ستاروں کی مانند چمکتے تھے سنہری ڈوری میں منسلک کر کے آویزاں

[1] یہ خط و کتابت میرے مسودات قلمی میں موجود ہے۔ مؤلف بیسا کہ اس کے اپنے ایک رقعہ سے واضح ہے۔

کر دئے گئے۔ محل کے وسط میں ایک مربع تخت گاہ بنا کر چاروں طرف جنگلا لگا کر سنہری نقش و نگار سے آراستہ کر دیا گیا۔ تب اس پر تخت طاؤس کو نصب کر دیا گیا۔ اور اس کے سامنے موتیوں کا ایک شامیانہ مرصع ستونوں پر نصب کیا گیا۔ جس کی قیمت پر ملک عامہ کا حاصل خرچ ہو چکا تھا۔ اور تخت گاہ کے اوپر جو چتر بلند کیا گیا تھا۔ اس کے دونوں طرف چتر میں موتیوں کی قطاریں ستاروں کی مانند چمکتے ہوئے بلند کی گئی تھیں۔ تخت مرصع کے ہر دو جانب دو زریں مینا کار چھوٹے تخت بچھائے گئے تھے۔ اور تخت کے پیچھے سونے کی میز لگا دی گئی تھی۔ جس پر کور خاصہ یعنی آلات شاہی جو شمشیر مرصع و جواہر طراز سپر برچھے پر مشتمل تھا جن کی زیبائش میں بیش بہا جواہرات صرف کئے گئے تھے رکھ دئے گئے تھے۔ دیوان خانہ کے سامنے صحن میں ایک بڑا شامیانہ سرخ جالی کے کپڑے کا چاندی کے ستونوں پر استادہ کیا گیا تھا جس کے چاروں طرف زربفت اور مخملی و زردوزی کے پردے لٹکا دئے گئے تھے۔ پھر رنگ رنگ کے فرش بچھا دئے گئے سرخ جالی کے آگے ایک نقرئی جنگلہ درمیان میں نصب کر دیا گیا تھا۔ دونوں طرف بڑے عالیشان زرنگار رخ گاہ نصب کر دئے گئے۔ در و دیوار دیوان عام و خاص کو زربافت مخمل، کلابتون دوزی و پردہ ہائے فرنگی و دیبا ہائے رومی و چینی سے مزین کر دیا گیا تھا۔ کمرے جو ایوان میں تھے ان کو بھی قسم قسم کی اشیائے آرائشی سے زینت دیدی گئی تھی اور زربفت اور زردوز مخمل کے شامیانے کمروں کے آگے صحن میں لگا کر رنگ برنگ کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ اور غسل خانہ کی عمارت جو انجمن خاص ہے اس کو بانواع زربفت و مخمل جو فلک اطلس کا نمونہ تھا۔ عظیم الشان ستونہائے نقرئی جن کی پیمائش کہکشاں سے ہو سکتی تھی غسل خانے کے آگے کیواں کی بلندی کے آگے لگا دیا گیا۔ اور خیمہ کے آگے چاروں طرف نقرئی مجمر زمین پر نصب کر دیا گیا۔ اس پر کرمانی نفیس قالین اور رنگین شاہی بساط بچھا دئے گئے۔ اور اس کے اندرونی حصے کو جو قبل ہی نگارخانہ چین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے کمال حسن کو محتاج مزید تکلف نہ سمجھا اور اس کو ویسا ہی رہنے دیا۔ اور

ایک دیگر مینا کار چھوٹا تخت جو اس مجلس خانہ کے لئے مخصوص تھا اس محل کے آگے بچھا دیا گیا۔ اور ایک زرین بڑا ہشت پہلو تخت جس کے اوپر بنگلہ نما چھت تھی اس محل کے بیچ میں رکھا گیا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف محلات کو بھی موتیوں سے مرصع زربفت مخملی سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ اور ان کے آگے زریں کمخواب و مخملیں شامیانے نصب کر دئے گئے تھے۔ اور محلات میں قسم قسم کے سونے وچاندی کے سامان جگہ جگہ میزوں پر لگا دئے گئے تھے۔ کہ دیکھنے والوں کی نگاہ جم کر رہ جاتی تھی مثنوی

چو خلد بریں محفلے سازند — بنظارہ چشم فلک باز شد
مزین بعہد نقش خاطر فریب — ہمہ آشنائے دل اما غریب
برنگینیٔ باغ در نو بہار — بزیبائے خلوت وصل یار
ہویدا در و نقش ہر صنعتے — زہر معنے جلوہ گر صورتے
ز نظارہ اش دیدہ رنگیں چناں — کہ شد بال طاؤس مژگاں ازاں

ابعدازاں جب کہ دولت خانہ بادشاہی آراستہ ہوگیا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ یک شنبہ ۲۴ رمضان المبارک سنہ ۱۰۶۹ھ جب کہ عالمگیر کی عمر بحساب شمسی ۴۰ سال و سات مہینے ۱۳ دن تھی، اور قمری حساب سے ۴۱ سال و ۱۰ دن تھی دن نکلتے ہی ۸ گھڑی اور سات پل گزرنے پر بادشاہ سلامت تخت حکومت جہانبانی پر بمرتبہ ثانی رونق افروز ہوئے اور امراء و عمائدین سلطنت اپنے ضابطہ کے مطابق تہنیت و مبارک باد بجالائے۔ اور رسم نذر و نچھاور ادا کی۔ اور ان کو خلاع عنایت کرنے، خطاب عطا کرنے، انعام بخشنے سے عزت بخشی اور امیر الامراء شائستہ خاں کو بادشاہ سلامت کا نوبت و نشان عطا ہوا۔ جیسا کہ اس کے باپ یمین الدولہ آصف خاں خان خاناں مرحوم کو جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں تمام امراء کے مقابلہ میں عطا ہوا تھا۔ اور ان کے سوا کسی کو بھی حکام میں سے یہ مرتبہ حاصل نہ تھا۔ اور خطیب نے منبر پر خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ بعد حمد و ثنا کے خاندان تیموریہ کی

عظمت و اقتدار کی تعریف کی۔ اور امیر تیمور سے لیکر شہاب الدین شاہجہاں تک کے اوصاف بیان کئے[1] اور خطیب کو خلعت گراں بہا سے سرفراز کیا گیا۔ اور بے شمار جواہرات و موتیوں و سیم و زر کے طبق بادشاہ پر نچھاور کئے گئے جس سے حاضرین کی جیبیں بھر گئیں۔ تمام وابستگان دولت کو انعام و اکرام سے مشرف فرمایا۔ اور عالمگیر لقب مقرر ہوا۔ سکہ جاری ہوا جس کا مفصل ذکر آگے آئیگا۔ اور فرامین عالمگیری کی پیشانی پر "ابوالظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" کا طغرا قائم ہوا۔

سات گھڑی تک دیوان عام میں جلوس فرما کر محل میں تشریف لے گئے۔ اور بیگمات کو بڑے بڑے انعامات دئے۔ یہاں سے غسل خانہ میں تشریف لائے۔ پھر اس کے بعد دربار عام منعقد کر کے لوگوں کی حسب معمول داد فریاد سننا شروع کی۔ اور لوگوں کو بڑے بڑے مرتبے عطا کئے۔ اور شہزادوں کو لاکھوں کا انعام دیا۔ اور ان کے بعد تمام منصب داروں کو حسب مراتب انعامات سے مالا مال کر دیا۔ غرضیکہ صلحاء، مستحقین، شعراء، ارباب طرب و نشاط اور سرود سرایاں کو انعامات لائقہ و صلات گرانمایہ سے سرفراز کیا۔ دو گھڑی تک اس دربار میں رہنے کا دستور دو مہینے اور ۱۹ روز تک رہا۔ ہر روز انعامات و اکرامات سے خلق عامہ کو مستفید فرمایا۔ اور ارکین سلطنت میں سے ہر ایک کو باری باری رسم نذر گزارنے کا موقع دیا گیا۔

سید محمد علی عادلشاہی سفیر اور محمد ناصر قطب شاہی حاجب جو تہنیت کے لئے معہ تحائف آئے تھے۔ حاضر خدمت ہوئے اور خلعت سے سرفراز ہوئے۔ اپنے نذرانے پیش کئے۔ عادلشاہ کی پیش کش کا تخمینہ آٹھ لاکھ اور قطب شاہ کے تحفے کا تخمینہ جو جواہرات اور مرصع آلات پر مشتمل تھا دو لاکھ کے قریب ہوا۔

علماء و شعراء نے بہت سی تاریخیں کہیں لیکن ان میں سے بہترین تاریخ وہ ہے جو ملا عزیز الدین

[1] یہ شجرۂ نسب آپ کی گود پر موجود ہے۔

ملا تقی المتخلص باصفہانی نے کلام الٰہی سے اقتباس کر کے حروف ملفوظ سے نکالی اور وہ یہ ہے :-

الملک للہ یوتیہ من یشاء (ترجمہ) ملک اللہ کے لئے ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

اور عید نوروز کو جو کہ عجمی بادشاہوں کی بڑی عید تھی بلکہ تمام جہان کی عید تھی کیونکہ تمام درختوں میں زندگی اور نباتات میں روئیدگی اور حیوانات میں تازگی کا سبب ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے (اعتنموا .... بالربیع الخ) جس کے مفہوم کو مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

گفت پیمبرؐ با صحاب کبار — تن مپوشانید از باد بہار

آنچہ با برگ درختاں میکند — با تن و جان شما میکند

اور عوض فروردین کے رمضان المبارک کو جشن نوروز کی ابتدا کی تاریخ مقرر کی اور یہ سم جشن عید الفطر تک رہتا تھا۔ محکمہ احتساب بھی اس نے قائم کیا۔ اگرچہ نشے اور دیگر ممنوعات کو پہلے بادشاہ بھی روکا کرتے تھے۔ مگر ان کے ہاں محتسب مقرر نہ تھے۔

غرضیکہ یہ مختصر سی کیفیت ابتدائے عہد سلطنت اس بادشاہ کی ہے جس کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں جو محض ہماری اپنی غفلت مطالعہ تاریخ کا باعث ہیں۔ ورنہ ہر امر واضح ہے۔

ع۱ سکندر در جہاں چو مہر منیر — شاہ اورنگ زیب عالمگیر ۔ یہ تمام مضمون عالمگیر نامہ اور سیر المتاخرین سے ماخوذ ہے۔

اسلامی تعمیرات

اورنگ زیب عالمگیر کا عہد فن تعمیر کے ضمن میں ایک عجیب و غریب زمانہ ہے کیونکہ ظاہرہ توہم اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ اس عہد میں فنون عام طور پر تنزل پذیر ہو چکے تھے۔ مگر جب ہم اس کی وسیع تر سلطنت کے حدود میں تعمیرات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ وہ شاہکار ملتے ہیں کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اور یہ امر محض اسلامی عمارات تک محدود نہیں بلکہ غیر اسلامی عمارات بھی تعداد اور انواع میں اسی طرح کثرت سے نظر آتی ہیں جو اس عہد میں تعمیر ہوئیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ماہرین اور محققین نے عہد شاہجہان کو فن تعمیر کا سنہری زمانہ کہا ہے۔ بلکہ معیار فن ہر اعتبار سے بلند پایہ اور اپنی نزاکت و باریکی بلکہ مضبوطی کی وجہ سے بھی ضرب المثل ہو گیا تھا۔ کہ آج تک اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اس عہد کی عمارات عام طور پر سنگ مرمر میں تعمیر ہوئیں جو اس عہد کا ایک طرۂ امتیاز بن گیا تھا۔

مگر عہد اورنگ زیب میں اس کی تمیز نہیں رہی یعنی ہر قسم کا جو مسالہ میسر آیا اسے استعمال کیا گیا۔ اور ہر موزون عمارت کو اس کے معیار کے مطابق تعمیر کیا۔ اس لئے عام طور پر ہر عہد کی تاریخ فنون جمیلہ میں معیار فن قائم کرنے کے لئے ہمیں ہمیشہ زیادہ تر فن تعمیر کو پیش نظر رکھنا ہو گا اور اس کے علاوہ اس کو اپنے عہد کا آئینہ تصور کرنا ہو گا۔ کیونکہ یہ فن دراصل جہات نو پیش کرتی ہے جنہیں پیش کرنے کے لئے ہر ممکن ذرائع کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ تاکہ نفسیاتی طور پر کوئی تو جمالیات کا پہلو فراہم ہو سکے جس کی تفصیل بہت طویل بیان کی محتاج ہے۔ تاہم اس نظریہ کی تسلی کے لئے ہمیں اس عہد کی بنائی ہوئی عمارات کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ جس عہد کے متعلق ہم کوئی رائے قائم کرنے کے لئے تعین کئے

جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے نظریات قائم کرنے والوں نے عام طور پر مسلمانوں کی عہد سابق کی عمارات کا خوب مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ مسٹر پنیل نے اپنی تالیف "شمالی ہند میں مشاہدات" میں لکھا ہے کہ "مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے تمدن کی تاریخ ان کے فن تعمیر میں مضمر ہے۔ اگر ان کے فن تعمیر کا مطالعہ کرنا ہو۔ تو ان کے محلات، مقبرے اور مسجدیں دیکھنی چاہئے" (صـ۱۱)

جب ہم بالاستیعاب عہد اورنگ زیب کی عمارات پر نظر ڈالتے ہیں اور اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس عہد میں مساجد کی تعمیر، قدیم عمارات کی مرمت اور ان کا احیا۔ قلعہ جات اور رفاہ عامہ کے لئے عمارات جن میں دریاؤں پر بند، شفاخانے وغیرہ کی عمارات زیادہ نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ان عمارات کی تعمیر کی ممانعت بھی کی جو ملک کے استحکام اور ملک کے سیاسی حالات میں مزاحمت کرنے والی تھیں۔ مگر ان میں بھی نظر آئے گا۔ کہ غیر اسلامی عبادت گاہوں کو تعمیر ہونے کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ ان کے لئے سرکاری خزانہ سے تالیف قلوب کے لئے روپیہ بھی عنایت کیا اور معافیاں بھی عطا کیں۔ جن کو ہم الگ زیر عنوان "معابد" بیان کر رہے ہیں۔ شکر کا مقام ہے کہ مسلمانوں نے اکثر اپنی عمارات پر کتبات بھی لگا کر ان کی تاریخی حیثیت کو مزید محفوظ کر دیا۔ کیونکہ اکثر جب تاریخ کسی صورت میں مدد نہیں کرتی تو ان عمارات کے کتبات کافی مدد کرتے ہیں۔ اور جب کوئی شہادت میسر نہیں آتی تو ہم طرز تعمیر اور اس عہد کے مسالہ کا اندازہ کرتے ہوئے مقامی روایات کی موجودگی میں کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

چنانچہ سب سے اوّل اورنگ زیب نے عنان سلطنت کو ہاتھ میں لیتے ہی جو کام کیا وہ سکہ میں اصلاح تھی جسے ہم ذیل میں سکہ جات میں بیان کریں گے۔ مگر اس کے بعد اس نے حصار قلعہ آگرہ کی تعمیر کی طرف شوال کے مہینہ ۱۰۶۹ھ میں توجہ کی۔ جس کی تفصیل عالمگیر نامہ میں ہے یعنی اس دوران میں حکم نافذ ہوا۔ کہ قلعہ اکبرآباد کا دور یعنی حصار شیر حاجی کی تعمیر کی جائے چنانچہ اعتبار خاں

کے اہتمام سے تین سال کے اندر یہ عمارت تیار ہو گئی۔ جس کی پوری کیفیت عالمگیر نامہ مصنفہ محمد کاظم کے الفاظ میں ملاحظہ ہو اور ان الفاظ سے آگرہ کے قلعہ کی پوری تاریخی حیثیت سامنے آجاتی ہے جو اکبر کے زمانہ کی تعمیر ہے بلکہ اسے شیر حاجی کیوں کہتے تھے اس کی پوری وضاحت ملتی ہے۔ پھر سامان، پتھر وغیرہ فتح پور سیکری کے پہاڑ سے کیونکر لایا گیا تھا۔

بنای حصار دولت آثار شیر حاجی بر دور قلعہ سعادت بنیاد مستقر الخلافۃ اکبر آباد

ازانجا کہ مہندس بنیان ایجاد و معمار حصون سبع شداد کاخ والای ایں دولت ابدی بنیاد را برای تشئید قواعد ملک و ملت و تاسیس مبانی حشمت و جلالت باوج رفعت و اعتلا برافراختہ رونق کہن سرای دہر دآباد دیرین بنا جمال بحسن تدبیر گیتی آرای ایں زینت افزای سرای آفرینش منوط و مربوط ساختہ لاجرم ہموارہ ہمت بلند جناب در حصانت و رصانت حصن دین و حصار دولت معروف مے دارند و پیوستہ اہتمام رای زریں و عقل متین بر استحکام بنای مملکت موید ایں کلام دریں خجستہ ایام احداث حصار شیر حاجی است بر دور قلعہ مستقر الخلافۃ اکبر آباد و چوں آں قلعہ دولت اساس فلک مماس کہ حضرت علیین مکانی عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ بنا کردہ انداز معظمات قلاع ممیعہ و حصون رفیعہ مملکت سپہر فسحت ہندوستان و مرکز و مقر ایں سلطنت گردوں نشان است و ازاں عہد ہمایوں تا ایں زمان سعادت مقرون ازبس بنفائس ذخائر از زر و جواہر مشحون گشتہ رشک افزای بحر و کان است و اکثر اسباب شوکت و ابہت ایں دولت ابدمدت دراں مے باشد و قبل ازیں فصیل کہ بلسان اہل عرف شیر حاجی گویند نداشت لہذا دریں ہنگام سعادت انجام کہ قواعد خلافت و اقبال از قوائم او رنگ حشمت و جلال خلیفہ زمان بتازگی مشید گردید و جہاں پیرا از پرتو دانش و تدبیر شہنشاہ عالمگیر رونق و جوانی از

سرگرفت رای عالم آرای که زینت بخش معموره هستی است چنان اقتضا نمود که آن قلعه مبارکه را باحداث حصار شیر حاجی استحکام بخشند و حکم لازم الانقیاد بنا ظمان مهمات مستقر الخلافه اکبر آباد صادر شد که حصاری استوار از سنگ سرخ فتح پور بر این وتیره که در قلعه مذکور بکار رفته است بنا کرده در اتمام آن کمر سعی و اهتمام بر میان بندند و شب سه شنبه پانزدهم ذی قعده این سال فرخ فال که واقفان اسرار تنجیم برای آن بنای آسمان شکوه همایون آثار ساعت اختیار کرده بودند بفرخندگی و مبارکی آن را اساس نهادند از جانب دریا ارتفاع دیوار بنا بر پستی زمین دوازده ذرع و فاصله تا دیوار قلعه شصت ذرع و عرض دیوار پنج ذرع و از دیگر جوانب که زمین رفعت داشت ارتفاع دیوار هفت ذرع و فاصله تا دیوار قلعه نیز هفت ذرع و عرض دیوار چهار ذرع و خندق در بیرون شیر حاجی مقرر شد و پنج دروازه که هر یک باب الابواب دولت و سعادتست بران حصار میمنت انوار قرار یافت از انجمله سه دروازه رو بروی دروازه هتیه پول و خضری و اکبری و یکی بر سمت یمین دروازه که در جانب شاه برج است و دیگری بجانب دریا محاذی دروازه خردی که در ته جهروکه مبارک است و کنگرهٔ و سنگ انداز بدستور قلعه مبارک معهود گردید۔ بالجمله بفرمان شهنشاه دین پناه معماران خبرت آئین صاحب مهارت واستادان فن عمارت دست کوشش بافراختن آنحصار و پرداختن آن بنای سپهر آثار کشوده صنعت طرازی و کارنامه پردازی بکار مے بردند۔ وخارا شگافان آهنین چنگ قوی بازو و سنگ تراشان فولاد دست فرهاد نیرو و داد استادی و هنر وری داده بنوک الماس تیشه نام کوهکن از صفحه ایام مے سترونده باهتمام تمام و تاکید و قدغن عظیم هر روز خلقی کثیر و فرقه انبوه کار میکردند تا آنکه در عرض مدت سه سال صورت اتمام و پیرایه انجام یافت۔"

اس کے آگے چل کر مصنف عالمگیر نامہ نے اس مسجد کی پوری کیفیت قلمبند کی ہے جو بادشاہ کے

خاص فرمان سے اسی سال ۱۰۶۹ھ میں قلعہ میں بنیاد رکھی گئی۔ جس کے متعلق محض اسی قدر عرض ہے کہ چونکہ بادشاہ درویش منش کا ارادہ یہ تھا کہ فریضہ نماز مسجد میں باجماعت ادا فرمائے لہذا قیام گاہ کے قریب ایک مختصر سی مسجد سنگِ مرمر کی نہایت منقش اور خوش وضع تعمیر فرمانے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ مقدس عمارت پانچ سال کے عرصہ میں تیار ہوئی اور اس کی تعمیر میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوئے۔ عاقل خاں نے آیۂ کریمہ "اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا" (تحقیق مسجدیں اللہ کی ہیں، اللہ کو کسی کے ساتھ شریک کرکے مت پکارو) سے بنائے مسجد کی تاریخ نکالی۔ عالمگیر نامہ کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں جن سے تعمیری خوبیاں اس مسجد کی عیاں ہیں:۔

بنائے مسجد فیض اساس مختصر نزدیک بآرام گاہ خاص اختصاص یافتہ

صلوات خمس وسنن ونوافل را در مسجد ادا نمایند بر پیشگاہ خاطر ملکوت ناظر کہ پیوستہ شاہراہ جنود ارادت الٰہی و سر منزل وفود عزائم قدسی است پرتو ایں عزیمت تافت کہ نزدیک بآرام گاہ خاص خجستہ مسجدی مختصر طرح اندازند وعبادت جای فیض اثر بسازند تا ہموارہ بسہولت وآسانی بی تجشم رکوب وطول حرکت در اوقات لیل ونہار از راحت کدۂ قدس بآں معبد ہمایوں آثار خرامش اقبال فرمودہ بطاعت دادار پاک وپرستش داور بے ہمال پردازند بنابراں در سمت شمالی عسلخانہ مبارک مابین عمارت آں نگاریں سرای حشمت وجلال وباغ خلد مثالش کہ موسوم بحیات بخش است زمینی برائے ایں کرامت انوار اختیا نمودہ بعماری توفیق مسجدی میمنت اساس از سنگ مرمر طرح فرمودند مشتمل بر دو ایوان عالی بنیان باہم در طول متصل وسقف ہر یک بشکل بنگلہ دو گنبد بریں ویسار برنہجی کہ در ایوان عقب کہ جای محراب است گنبد از بیرون چنداں نمودار نباشد وبر بالای ایوان پیش سہ گنبد عالی نمایاں باشد یکی بر بالائے بنگلہ و دو بر ہر دو بازو وطول عمارت پانزدہ ذرع وعرض نہ

ذرع سوای اساس و طول صحن آں پانزده ذرع و عرض دوازده و نیزده تسو وار تفاع زمین کرسی
عمارت از صحن یک و نیم ذرع و بر سمت شمالی ایں عمارت مختصر ایوانی طولش پنج ذرع و عرض سه و نیم
ذرع یک و رازاں بجانب ایوان مسجد و نه منظر بسمت باغ حیات بخش مطبوع فردی کہ آب ازاں جوشد و
از صحن مسجد سه در بجانب باغ کشوده و پنجم ربیع الثانی ایں سال ہمایوں فال کہ رایات عز و جلال در
ساحل رود گنگ نشاط اندوز سیر و شکار بود باشاره والا مسجد مذکور اساس یافته متصدیاں مہمات
عمارت کرسی و اجتہاد و باہتمام آں بنا مشرافت بنیاد بر میاں ہمت استوار ساختند و از معماران پیشه ور و
بنایان ہنر گستر و سنگ تراشان فرہاد فن و خارا شگافان کوہ شکن و نقاشان سحر طراز و طراحان کارنامہ پرداز
ہر روزگرد ہی انبوہ در عمارت آں مسجد قدسی شکوہ بازوی جہد و سعی کشوده بکار پرداختند۔ و اگرچہ
در عرض اندک مدتی بتاکید اہتمام تمام ایوان اصل مسجد مہیا گشته چناں شد کہ حضرت شاہنشاہی دراں
نمازے گذارد و لیکن آں بقعہ مبارک بالتمام در مدت پنج سال پیرایه اتمام یافت و مبلغ یک لک و
شصت ہزار روپیه صرف آں شد بالجملہ آں فرخنده مسجد عالی بنا اگرچہ عمارتش مختصر است لیکن زیب و
زینت و فیض و کیفیت آں در مرتبه قصوی و درجۂ آں سراسر تختہای سنگ مرمر کہ بنوک تیشه استادان
ہنر پیشه تراش یافته چناں تنگ در زبکار رفته است کہ گوئی از معدن صنع یک لخت بر آمده تجلیه و
تصفیه بمثابه صفا و صقال یافته کہ پای نظر ژرف نگاہاں بر سطح آں لغزش پذیرد و نقاشان نازک
دست بدائع نگار طاق و رواق و سقف و جداراں را سوای ازارۂ دیوار بگوناگوں نقشهای
دل پسند غریب و الوان گلہا و بوہائے مرغوب خاطر فریب کہ طراحان جادو قلم بر صفحه سنگ رقم
زده اند میمنت کرده کارنامہ ہنر پرکار قرار یافته روشنی و صفائی آں بمرتبه است کہ سطحش باصرح
مسمر دوم مساوات مے زند و از صفحه آئینه حکایت مے کند و گنبدہای آسمان شاں آں مسجد فیض نشاں
را از تنگه پوشش ساخته مطلای ناب تلمیع نموده اند و ہمچناں سرکلاسنہا را بگلہای ملمع مہر فروغ و

زیب و زینت فزودہ بی شائبہ تکلف وصف طرازی و آب و رنگ سخن پردازی نظارگیان را از مشاہدۂ آں گنبدہای فلک اعتلا کوہ ہای علا بنظر می آید و ہر گاہ پرتو آفتاب بر آں می تابد تیز بینا نرا از بارقہ انوار ملمش دیدہ بخیرگی میگردید ؎

بناء ز انوار رحمت چو طور — ستونہای مرمر علیای نور
ز گل دستہایش کہ شد اوج گیر — جوانانہ گل زد بسر چرخ پیر
فلک را در دیشت طاعت دوتا — ز انجم بکف سبحۂ کہربا
نمایاں ز سنگ لطافت سرشت — کہ شد سجدہ عکس خط سر نوشت

"تاریخ اتمام ایں بناء قدسی احترام ملائک مقام را عاقل خاں کہ از نیکو بندہای قابل ایں درگاہ گردوں نشانست آیہ کریمہ "وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا" یافتہ اگرچہ زیب و زینت و تکلفات ایں مہبط انوار برکات در سال ہزار و ہفتاد و سہ کہ عدد حروف ایں آیت وافی ہدایت مشعر آنست مرتب شدہ بود چوں تاریخ مذکور کمال ندرت و غرابت دارد پسند طبع ہمایوں آمد و بموجب امر اعلیٰ دراں بقعۂ مقدسہ بر سنگ ثبت افتاد۔"

اس سے اورنگ زیب کا ذوق جمالیات بھی واضح ہے کہ اس نے قلعہ آگرہ کی تمام عمارات شاہ جہانی کا ماحول کا اندازہ کرتے ہوئے اس مسجد کو بھی اسی معیار پر سنگ مرمر کی تعمیر کی ورنہ ان سے بھی زیادہ معمولی مسجد تعمیر ہو سکتی تھی۔ اور اگر آج ہم اس مسجد عالمگیر کو قلعہ کی دیگر عمارات میں تلاش کرتے ہیں تو ہمارے نزدیک یہ مسجد آج زنانی مسجد کے نام سے مشہور ہے اور دیوان خاص کے گوشہ جنوب و مغرب میں تین در کی ایک چھوٹی سی مسجد ملتی ہے۔ عالمگیر نامہ میں اس کے ایوان کا طول پانزدہ ذرع اور عرض نہ ذرع لکھا ہے جو اس زنانی مسجد کی پیمائشوں پر صادق آتی ہیں۔ جو آج اپنی پیمائشوں کے اعتبار سے اندر سے قریب قریب ۲۲ فٹ اور ۱۳ فٹ ہے یعنے

عالمگیر نامہ فارسی ملاحظہ ہو۔

ذرع ایک ہاتھ قریب میں انچ کا ہوتا ہے۔ اس مسجد کے یعنی دیوان خاص کی پشت پر ایک راستہ سے گذر کر اس مسجد میں پہنچتے ہیں یہ سنگ مرمر کی نفیس مسجد بعد میں تو کیا بلکہ اسی زمانہ سے بیگمات حرم کے لئے وقف ہوگئی۔ اس میں دو قطاروں میں ۱۸ مصلے ہیں اور صحن بھی اسی مناسبت سے ہے۔

اس کے بعد ہم دہلی کے لال قلعہ کے اندر موتی مسجد کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ۱۶۵۳ء میں بقول سرسید تعمیر ہوئی۔ یہ قلعہ میں متصل باغ حیات بخش بنائی گئی۔ سر سے پاؤں تک سنگ مرمر کی ہے۔ بلکہ اس کا فرش اور تمام در و دیوار و محراب و مرغول اور صحن اور منڈیر سب کے سب سنگ مرمر کی ہیں۔ پھر ان پر منبت کاری کی ہوئی ہے۔ اور ایسے ایسے گل بوٹے بیل پتے کاٹ کر بنائے گئے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقت میں قلعہ کی کسی اور عمارت میں ایسی منبت کاری نہیں ہے۔ اس مسجد کے بھی تین در ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے دو مینار ہیں۔ اور تینوں گنبد سنہرے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض نے اسے سنہری مسجد بھی لکھا ہے۔ اس کے صحن میں ایک مختصر سا بہت موزون حوض بھی ہے۔ اور ایک حجرہ بھی خادم یا امام کے لئے ہے۔

رقعات عالمگیری میں ایک رقعہ بنام فرزند جسونت کھتری جسے شاہجہاں نے خطاب "رائے" سے ممتاز کیا تھا کے ضمن میں یوں ملتا ہے:۔

"——— چہار پنج منصب دار آخر روز کہ ماہ در عسلخانہ نقشہ صوبجات و عمارات می نمایند بنظر گذراند تا حسب و نسب ہریک بنظر ثالث دریافتہ برائے جاگیر حکم فرمائیم"۔۔۔ (رضی اللہ عنہ) جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ باقاعدہ تمام کاغذات و نقشے پیش ہوتے تھے۔ جب ۱۰۷۶ھ میں اپنے والد (شاہجہاں) کا آگرہ میں انتقال ہوا۔ تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی خاص الگ مقبرہ تعمیر کیا جائیگا جو کبھی مرحوم کا اپنا خیال تھا۔ کہ موجودہ تاج کے سامنے جمنا کے دوسرے کنارے پر سنگ سیاہ کا تعمیر کیا جائے۔ تاکہ ایک موزونیت پیدا ہو۔ مگر حالات اس قدر بدل چکے تھے۔ کہ یہ ناممکن

ہوگیا تھا کہ کوئی الگ عمارت تعمیر کی جائے۔ مگر اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس کو بھی تاج میں اس کی بیوی کے پہلو میں دفن کر دیا جائے۔ حالانکہ جب تاج کی تعمیر ہوئی تھی، کوئی ایسا خیال نہیں تھا۔ کہ اس میں کسی اور کی بھی قبر بنے گی۔ کیونکہ ممتاز کی قبر بالکل مرکز میں ہے۔ نہایت احتیاط سے ایک طرف کر کے شاہجہان کے تعویذ کو بھی بنایا گیا۔ چونکہ یہ مردانہ تھا اور مرحومہ کے زوج کا تھا اس لئے اسے ممتاز کے تعویذ سے بڑا بنایا۔ سب سے بڑھ کر اس کی پرچین کاری میں بیل بوٹے اور وہی تمام اقسام کے قیمتی پتھر بھی استعمال کئے گئے۔ اس تعویذ کے اعلیٰ معیار فن کا یہ ایک بین ثبوت ہے کہ آج بہت کم زائرین تاج کو دیکھنے والے اس تیس سال کا فرق ذہن میں رکھتے ہیں جب کہ ممتاز کا روضہ تعمیر ہوا تھا۔ غرضیکہ ہم بطور نتیجہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اورنگ زیب کو ماحول فن کا اندازہ ہی تھا تو یہ ہوا۔ ورنہ اس کو ویسا ہی چھوڑ دیتا تو کون مواخذہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح بے شمار عمارات آگرہ میں تعمیر ہوئیں مگر ان میں وہ ضرور قابل ذکر ہیں جو آگرہ کے قریب فتح پور سیکری کے مشہور مقام میں تعمیر ہوئیں۔ ان میں قابل ذکر حمام و مکان ابراہیم معصوم بن شیخ زین اولیا جو مغربی دروازہ کے قریب ۱۰۹۹ھ کی تعمیر ہے ایک مسجد ۱۱۱۷ھ میں فتح محمد نے تعمیر کی۔

مآثر عالمگیری میں ۱۰۹۷ھ کے واقعات کے تحت جبکہ حیدرآباد فتح ہو چکا تھا جس کی تاریخ فتح کو یوں بیان کیا گیا ہے ؎

"شد فتح بہ جنگ حیدرآباد"

کے بیان کے تحت ایک معمار کلیان پسر ہمیرا کا ذکر ملتا ہے جو اس قافلہ کے ساتھ ختم ہو گیا تھا جو شاہزادہ شاہ عالم فاتح حیدرآباد کی طرف جا رہا تھا۔

دہلی :- ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اورنگ زیب نے قلعہ شاہجہان آباد میں موتی مسجد کی تعمیر کی اور آج اس کو دیکھ کر کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ معیار فن جو اس میں برقرار رکھا گیا تھا وہ دیگر گرد

نواح کی شاہجہاں کی اپنی عمارات سے کم نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد یہاں ۱۶۹۳ء میں جبکہ جہاں آرا کا انتقال ہوا تو حضرت نظام الدین اولیاء کے احاطہ کے اندر ایک الگ جنگلا بنایا گیا۔ اسی طرح دیگر عمارات بھی بنائی گئیں۔ مگر دہلی کی عمارات کے متعلق رقعات عالمگیر سے ذیل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

"اعلیٰ حضرت را در طراوت باغ حیات بخش و دیگر اماکن واقع دولت خانہ از آراستگی اشجار و پرورش اثمار و صفای اسکنہ و میاہی و ترتیب نہالاں را نہار توجہ مفرط بود تا ایام اقامت دارالخلافہ ایں مسافر نیز مرآنہا نظر می نمود اکبر محمد خاں خود رفتہ در نزہت و خورمی آں موکد باشد چہ بہتر والا حالا باید کہ یکبار خود ہر روز رفتہ کماینبغی مقید بہ تزئینہ و تصفیہ عمارت و ریاض باشد و جمیع کیفیت ہای کم و کاست معروض دارد و تفصیل باغات و عمارات قلعہ مبارک و صاحب آباد و اعزا آباد و نوربازی سرحد باری کہ تعلق بہ ہمشیرہ عزیز القدر دارد و تعہد انہار و اشجار را زوقت برآمدن ایں بیروں رفتی تا حال باتفاق بیوتات کا المعائنہ شدہ نیز بسرکار ذیل نقشہ می فرستد و کیفیت باغ انگوری و دیگر باغات پائین قلعہ و باغ محسن خاں کہ تعریفش بسیار میکند و نیز از نقاب سموع شدہ عرضداشت کند تا حقائق باحسن وجوہ دریافت شود و زدہا در شکست و ریخت آنہا دادہ آید۔

افسوس کہ تعمیر خرابہ دل نکردم و ہمچو اطفال عمر بلہو و لعب احتمال باختم۔ (رباعی)

افسوس کہ عمر رفت و ہشیاری نیست ۔۔۔ در واکہ امید خویشتن داری نیست
گفتم کہ چو بیدار شوم روز بود ۔۔۔ ہیہات کہ روز رفت بیداری نیست

اسی طرح ایک موقع پر اورنگ زیب نے جہاں آرا کے باغ کے متعلق لکھا:۔

"از خارج بعرض رسید کہ ہنگام نمودن فرزند زادہ بفتح پور باہرہ سراں بر موضع دہرہ کہ جہت مضاف باغ جہاں آرای صاحبہ تعلق دارد تاختند و بیگم دریں باب بآں بیدار بخت نوشت و ایشاں در جہات معذرت نامہ بخدمت بیگم نگاشتند۔ ایں مقدمہ را خر بجناب ما نوشت و سوال

جواب کہ میان ہم واقع شدہ مانع مخفی داشت "

ایک موقع پر باغ کے پھلوں کے متعلق بالخصوص آم کے متعلق لکھا:۔

"والی جہانیاں و آبجیات بادیگر انبہ ہای خوب خوب رسید برای بعضے انبہ ہای گمنام کہ درخواست مطالب کردہ اند جودت طبیعت الفرزندان فرزندہم مقتضی گذاشتن اسم حسب حال بود بہرحال از بنجارہ رستابلاس جودت ہارس نامیدہ شد انبہ ذائقہ پسند بذائقہ پدر پیر خوشگوار افتاد نعمت و دولت پسران جوان زیاد باد "

اس کے بعد نواب جعفر خاں کو پھولوں وغیرہ کے متعلق لکھا اور آج تک جو جعفری پھولوں اور جعفری کا ذکر بطور اصطلاح ادب میں آتا ہے وہ اسی نواب جعفر خاں کی طرف منسوب ہے۔ یہ شخص اورنگ زیب کا وزیر اعلیٰ بھی رہا تھا۔

"بجعفر خاں کہ گلگشت اعزاباد باغ پھول باری درخواست کردہ اعلحضرت نوشتند بر چند گل جعفری بہ کمال شگفتگی نرسیدہ اما صد برگ ہزار برگ و سامان پیش ایوان ساخت۔ باغ گلفشاں بخوبروی شگفتہ البتہ بردود کلی آنزاطرہ تارک مباہات نماید و بہ ثمرات آں ثمرہ افتخار بدست آرد "

لاہور میں اورنگ زیب ۱۰۵۶ھ میں جب آیا تو اس وقت جہاں آرا کا باغ جس کی اس وقت محض ایک ڈیوڑھی باقی رہ گئی ہے۔ اور آج چوبرجی کے نام سے مشہور ہے اور اس میں سے بھی تین مینار یا برج باقی رہ گئے ہیں اس وقت مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے متعلق ممتیرہ کو ایک رقعہ میں یوں لکھا:۔

"بحوالی دارالسلطنت لاہور رسیدہ وزمانے بتماشائے باغ فیض و فرح بخش پرداخت و یک کروہ از انجہرہ (موجودہ اچھرہ) گذشتہ منزل نمود۔ از خوبیہائے ایں ابنیات و عمارات ہرچہ نوشتہ کم است۔ بعد ازاں لحظہ سیر باغ سرکار عالیہ نشاط افزائے خاطر مشتاق گشت و از مشاہدۂ

تالاب و عمارت کہ بنا زگی اساس یافتہ بہجت فزاداں اندوختہ بغایت جائے تفریح دل کشائیست"۔
بلکہ اس اقتباس میں موجودہ باغ شالامار کا ذکر بنام باغ فیض بخش اور فرح بخش موجود ہے جس طرح اس وقت وہ مشہور تھا اور یہ مقامی نام شالامار بعد میں پڑ گیا۔ یعنی اورنگ زیب نے دوران قیام لاہور کے باغات کی سیر کی اس سے واضح ہے کہ وہ جمالیات کا انسان بدرجہ اتم تھا۔
محمد افضل سرخوش نے اپنے تذکرہ کلمات الشعراء میں بختاور خاں کے باغ و حمام، مسجد و تالاب جو اس نے اورنگ زیب کے عہد میں تعمیر کئے تھے ان کے متعلق یوں اشعار درج کئے ہیں:۔

در ہمایوں عہد عالمگیر شاہ — زیب تخت و تاج فخر دین و داد
بہر تعمیر سرائے دل کشا — خان بختاور کف ہمت کشاد
رونقش از مسجد و گلشن فزود — آبروی دیگر از تالاب داد
چوں شد ایں معمورہ دلکش بنا — دہر بختاور نگر نامش نہاد
خوانست طبع سرخوش جام سخن — سال اتمامش ز فیض باد داد
شاد و خرم زد برآمد راہرو — گفت بختاور نگر آباد باد

اور اسی طرح روشن چراغ دہلی کے سب دروازے سنگ سرخ کے مع جالیاں جنوب کی طرف لگوائے گئے۔ اور گنبد چونے پتھر کا بنایا گیا۔ اور اس پر سنہرا کلس بھی بنوایا۔ سنگین چھجہ گنبد میں اسی عہد میں بنوایا پس فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد میں ترمیم و مزید تعمیرات تو ہوئیں۔ غرضیکہ اسے پورا احترام بزرگاں تھا۔

۱ از نقاش گرائم ۲ رقعات عالمگیری صـ۲۴

دہلی کے قرب میں فرید آباد میں بعض عمارات اس عہد میں تعمیر ہوئیں جنہیں بختاور خاں نے تعمیر کیا تھا۔ اور رہتک کے علاقہ میں کئی عمارات نظر آتی ہیں جن میں ۱۰۷۸ھ کی ایک مسجد کی مرمت ہے، قصابوں کی مسجد کی تجدید اور مسجد و مقبرہ دولت خاں قابل ذکر ہیں۔

پانی پت میں مزار بوعلی قلندر کی ۱۰۷۱ھ میں نئی تعمیر ہوئی۔

دہلی کے قرب میں ہانسی ایک قدیم بستی ہے جہاں مسلمانوں نے بالکل ابتدا ہی سے تعمیرات کیں جن کا سلسلہ برابر قائم رہا چنانچہ اورنگ زیب کے عہد میں یہاں حسن رضا نے ایک نہایت مطبوع مسجد ۱۰۹۷ھ میں تعمیر کی۔

متھرا :- مآثر عالمگیری میں مذکور ہے کہ عبدالنبی خاں فوجدار متھرا نے موضع بسہراہ کے مفسدوں پر ۱۰۷۱ھ میں حملہ کیا اور وہ فتح یاب ہو کر انتہائے جنگ میں ایک گولی سے ہلاک ہو گیا اور متھرا میں اس کی مسجد یادگار ہے۔

حصار:- اسی طرح حصار میں بھی مسجد عبدالنبی بہت مشہور ہے جس کی ۱۱۰۶ھ میں تجدید ہوئی۔ وہ اس عہد کا امیر و کبیر تھا۔

اور مشہور قصبہ سادھورہ ضلع انبالہ میں مسجد عبدالوہاب ۱۰۸۰ھ میں تعمیر ہوئی۔ یہ مقام بہت مشہور تھا۔

لاہور:- افسوس لاہور میں قبل عہد مغل کے چند آثار ایسے ملتے ہیں جن کے متعلق کوئی مستند اطلاع نہیں ملتی۔ اور وہ کچھ تو شہر کی چار دیواری میں ہیں اور کچھ چاہ میراں کے قرب و جوار میں ہیں۔ عہد مغل کے آثاروں میں سب سے اوّل باغ مرزا کامران راوی کے کنارے ملتا ہے جہاں بابر ۹۳۲ھ میں آکر ٹھیرا تھا۔ اس کے بعد اکبر نے لاہور کو از سر نو تعمیر کیا۔

اورنگ زیب عالمگیر نے تخت نشین ہوتے ہی کچھ ناسازی طبیعت کی وجہ سے کشمیر کا سفر اختیار کیا۔ لاہور

سے گذر ہوا۔ یہ بادشاہ کا پہلا شاہی داخلہ تھا۔ اور باغ دلکشا میں راوی کے کنارے بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ اور دربار ہوا جس میں دور دراز کے سفرا نے بھی حصہ لیا۔ بادشاہ اورنگ زیب نے اپنے چھٹے سال جلوس براق بیگ ایرانی سفیر شاہ عباس کا خیر مقدم لاہور میں ہی کیا تھا۔ اور یہاں سے بہت تحائف دیکر تربیت خاں کے ہمراہ رخصت ہوا۔ کشمیر سے واپسی پر لاہور شہر کا صوبہ دار فاضل خاں فوت ہو چکا تھا جسے اس کی اپنی وصیت کے مطابق اس کے اپنے بنا کردہ باغ میں دفن کیا گیا۔ جس کا اگرچہ اب نشان تک لاہور میں مع اس کی قبر کے نہیں ملتا۔ تو بادشاہ پھر دریائے راوی کے کنارے دلکشا باغ میں اپنے دادا جہانگیر بادشاہ کے مزار پر فاتحہ کے لئے تشریف لائے۔ اور روضہ کے مجاوران کو دس ہزار روپیہ انعام دیا۔ اور اس نے شاہ برج (قلعہ) میں جشن کیا جو عالمگیر نامہ میں یوں مذکور ہے جس سے اورنگ زیب کی بلند پایہ جمالیات ملاحظہ ہو:۔

"یازدہم ربیع الثانی مطابق بیستم آبان در عمارات فیض بنیاد شاہ برج دارالسلطنت لاہور کہ در رفعت و شان عزت بخش چرخ ذات بروج و آفتاب ہر صبح بعزم تماشای آں شگرف مکان بر زبان نہ پایہ فلک در عروج الست و باشارہ ہمایوں پیشکاران پیشگاہ دولت برای ایں جشن بجہت طراز آں رابط بساط تجمل و احتشام بنوعی کہ معمول ایں سلطنت گردوں بسطت است زیب و آرائش فزودہ بودند۔ خجستہ بزمے دلکشا و مقدس محفلے مسرت پیرایہ انعقاد یافت و خورشید گیتی فروز اوج عظمت و اقبال پرتو ورود بہ برج میزان افگندہ وزن مسعود بآئین معہود بفعل آمد۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اورنگ زیب کی عمر کا چھیالیسواں سال شروع ہوا تھا۔ اور اس اقتباس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دوران قیام لاہور قلعہ لاہور کے شیش محل میں مقیم ہوا۔ کیونکہ اس کا ذکر بلفظ شاہ برج اس میں موجود ہے۔ جو بادشاہ نامہ میں ملتا ہے۔ اور یہیں جشن وغیرہ ہوا۔ اس کے

علاوہ ہم نے متذکرہ بالا صفحات میں اورنگ زیب کا ورود لاہور ۱۰۵۶ھ کا بھی ذکر کیا ہے۔
مگر لاہور میں ابھی شاہجہانی عمارات کی تازگی اور ان تعمیرات کی اہمیت قائم تھی یعنی خوب آباد
تھیں۔ خاص کر خانقاہ حضرت میاں میر صاحبؒ متوفی ۱۰۴۵ھ صوفیائے کرام کی آماجگاہ تھی۔
خصوصیت سے مُلّا شاہ بدخشی جو آپ کے مرید تھے وہ وہاں مقیم تھے۔ اس کا انتقال ۱۰۷۱ھ میں ہوا۔ آپ
کا مقبرہ قصبہ میاں میر میں موجود ہے۔ جس کا گنبد اور باقی تعمیر نہایت شاندار ہے۔ بلکہ تمام گاؤں بہت
اعلیٰ تعمیر شدہ تھا۔ جس کے آج تک کاشی کاری کئے کونوں کے برُج موجود ہیں جن سے اس تمام گاؤں
کی تعمیر کی عظمت واضح ہے۔ ۱۰۷۹ھ کا وہ زمانہ ہے جب لاہور میں بادشاہ شاہجہاں کے مشہور موخ
آل محمد صالح کنبوہ نے موچی (موتی) دروازہ میں ایک مسجد تعمیر کی جو آپ کے مکان کے قریب تھی۔ یہ
مسجد اپنی اعلیٰ کاشی کاری کی اینٹوں کی وجہ سے مقامی طور پر چینیانوالی مسجد کہلاتی ہے۔ اور اس کے
دروازہ کے ماتھے پر آل محمد صالح کا نام کندہ ہے جس کا انتقال یہاں ۱۰۸۴ھ میں ہوا۔ اور وہ ایک
اعلیٰ گنبد تکیہ کمبوہاں میں موجود ہے جس میں ہر دو بھائی فتح عنایت اللہ اور محمد صالح مدفون ہیں۔
افسوس یہ بھی گنبد دار مقبرہ عیسائیوں کے قبضہ میں ہے۔ اس کے بعد ہم محلہ چابک سواراں میں جہاں
راقم بھی قدیم زمانہ سے اپنے آباؤ اجداد کے مکان میں ہنوز مقیم ہے ایک مسجد شاہی زمانہ کی
موجود ہے۔ جسے بوجہ کثرت کاشی کاری کے اینٹوں کے چینیانوالی مسجد کہتے ہیں۔ ایک امیر کبیر
سرفراز خاں نے اسے ۱۰۸۲ھ میں تعمیر کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ مسجد قدیم حویلی میاں خاں کا حصہ تھی۔ جو در
اصل نواب سعد اللہ خاں کا مکان تھا۔ اور اس کے لڑکے لطف اللہ خاں عرف میاں خاں سے منسوب
تھا۔ یہ حویلی موچی دروازہ سے لیکر رنگ محل اور اس مسجد تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہم
لاہور میں تعمیر مسجد بادشاہی دیکھتے ہیں۔ جسے اورنگ زیب نے اپنے رضاعی بھائی فدائی خاں کوکہ کے
زیر اہتمام ۱۰۸۴ھ میں تعمیر کروایا تھا۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے :-

مسجد کے دروازہ کے ماتھے پر ذیل کا کتبہ ہے:۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

مسجد ابوالظفر محی الدین محمد عالمگیر۔ بادشاہ غازی
سنۃ ہزار و ہشتاد و چہار (۱۰۸۴) ہجری اتمام یافت
باہتمام کمترین خانہ زادان، فدائی خاں کوکہ

اور اس مسجد کے متعلق مآثر عالمگیری میں واقعات ۱۰۸۶ھ کے تحت ملتا ہے کہ

"بادشاہ کی سواری مبارک جامع مسجد سے واپس ہو رہی تھی کہ قبلہ عالم کشتی سے اُتر کر تخت رواں میں سوار ہو رہے تھے کہ ایک بدبخت شوریدہ سر نے جو گرو تیغ سنگھ کا چیلہ تھا دو اینٹیں پھینکیں جن میں سے ایک تخت پر گری۔ پیادگان جلو نے اس بدنصیب کو گرفتار کر کے کوتوال کے حوالے کر دیا جس کے بعد اورنگ زیب نے لاہور سے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ یعنی اورنگ زیب نے اس مسجد میں خود نماز ادا کی اور خود اس کی تعمیر کرائی۔ اور دیگر مجالس نکاح وغیرہ میں بھی دوران قیام لاہور حصہ لیا۔ اور اورنگ زیب کے عہد کی کوئی تاریخ اس مسجد کی تعمیر کا کہیں تفصیلی ذکر نہیں کرتی۔ مگر حسن اتفاق سے میرے اپنے ذاتی کتب خانہ میں ایک مخطوطہ تاریخی تحریروں پر مشتمل موجود ہے۔ ان میں ایک تحریر بصورت فرمان شاہی موجود ہے جس سے واضح ہے کہ صوبہ دارالسلطنت لاہور تو جہات شاہی کا مورد بنا اور فرمان جاری ہوا کہ ایک مسجد نزاہت و لطافت میں ضرب المثل دارالسلطنت لاہور میں تعمیر کی جائے۔ اس صوبہ کے لئے مبلغ تیس لاکھ (۳۰) روپیہ مسجد کی تعمیر کے لئے وقف کر دئے اور یہاں کے حکام کو حکم دیا گیا۔ کہ اس کے مطابق فوراً عمل کر کے مسجد مذکور کو جلد تعمیر کریں۔"

عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مسجد پر جو مصالحہ صرف ہوا وہ داراشکوہ نے حضرت میاں میر صاحبؒ کے روضہ کی تعمیر کے لئے جمع کیا تھا۔ حضرت میاں میر صاحبؒ کا انتقال ۱۰۴۵ھ میں ہوا۔ یعنی ۱۰۸۴ھ میں تقریباً چالیس سال بعد یہ مسجد تعمیر ہوئی اور پھر داراشکوہ نے خود بھی آپ کی وفات کا ذکر اپنی تالیف سکینۃ الاولیاء میں کیا ہے۔ جو ۱۰۵۲ھ کی تصنیف ہے۔ اگر اس میں صداقت ہوتی تو وہ خود اسے بیان کر دیتا۔ اس مسجد کے معمار اعلیٰ کا نام تاج محل آگرہ کے معمار کی طرح نہیں ملتا اس لئے ہمیں قیاس آرائی کا حق نہیں پہنچتا۔

اس کی عظیم ترین پیمائشوں کی موجودگی میں جب دنیا کی مشہور و معروف دیگر مساجد پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہی مسجد دنیا کی سب سے بڑی مساجد میں شمار ہوتی ہے اور اس میں کم و بیش (۷۰۰۰) نمازی بیک وقت نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں۔ اکثر لکھنے والوں نے اس مسجد کو دمشق کی مسجد اموی اور حرم مکہ معظمہ کی مسجد کے نمونہ پر بیان کیا ہے جو بالکل بے بنیاد ہے۔

اس مسجد کا ایوان ایک بہت عظیم الشان سنگ سرخ کی عمارت ہے جس کے درمیانی کماندار بلند حصہ کو درگاہ بھی کہتے ہیں۔ جو اس مسجد میں نصف گنبدی حالت میں بہت نمایاں ہے۔ اس درگاہ کے اندر کی طرف شروع ہی میں سنگ مرمر میں نقش و نگار کی بیل سرخ پتھر کو کھود کر بھر دی گئی ہے مگر یہ تمام نقوش ابھرے ہوئے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس قسم کی پرچین کاری یعنی پتھر پر پتھر ہی کے نقوش بھرے گئے ہوں اور پھر ابھرے ہوئے ہوں۔ دنیا بھر میں کسی عمارت میں نہیں ملتے۔ اور یہ تمام بیل نیچے سے شروع ہو کر تمام کمان کے ساتھ ساتھ اوپر تک پھیلا دی گئی ہے۔ جس نے اس کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ یعنی یہ عجیب و غریب سفید نقوش سرخ سطح پر لگا کر رکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر تاریخی طور پر اس نمونہ کی بیل کا پتہ لگایا جائے تو یہ پمپی روم یا طاق بستان ایران کی قدیم عمارات کی ایسی بیل کے مشابہ نظر آئے گی۔ اور اس درگاہ کے اوپر

دونوں سروں پر برجیاں شرفہ دار بھی ہیں۔ جن سے اس کی شان اور متمیز ہو گئی ہے۔ اس درگاہ کے دائیں اور بائیں ایوان کے ماتھے پر پانچ پانچ پیش طاق بطور در ہیں۔ اور یہ درگاہ کی نسبت کافی نیچے ہیں تاکہ درمیانی حصہ کافی واضح ہو جائے۔ ان کے وسط میں ایوان کے اوپر ایک ایک بلب نما یا شلغم کی شکل کا گنبد مرمریں ہے۔ اور ایوان کے درمیان درگاہ میں محراب والے حصہ کے اوپر درمیانی بڑا گنبد ہے۔ یعنی تین مرمریں شلغمی گنبد بہت ہی موزون معلوم ہوتے ہیں۔ پھر ان تینوں گنبدوں پر سنہری کلس ہیں جو سورج کی روشنی سے خوب چمکتے ہیں۔ جس سے ان گنبدوں کی شان بڑھ جاتی ہے۔ یہ گنبد تعمیر میں دُہرے ہیں اور ہر ایک کا گردنہ الگ الگ نظر آتا ہے جو اندرونی گنبد کو سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ امر ایوان میں کھڑے ہو کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ گنبد قطری کماندار مقرنسوں پر کھڑے ہیں۔

بعض لکھنے والوں نے محض غلطی سے اور بغیر صحیح مآخذ کا مطالعہ کئے ہوئے لاہور کی بعض عمارات کو اورنگ زیب کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ جن میں خاص کر نواں کوٹ کی عمارات اور ملتان روڈ پر چوبرجی۔ حالانکہ چوبرجی پر صاف تاریخ ۱۰۵۸ھ اور جہاں آرا بیگم کا نام بصورت خطاب "بیگم صاحب" درج ہے۔ جس کے ۱۳ سال بعد اورنگ زیب بادشاہ بنتا ہے۔ البتہ لاہور میں اورنگ زیب کا سب سے بڑا کارنامہ جو اس کی مسجد کے بعد نظر آتا ہے وہ بند عالمگیری ہے۔ جو ۱۰۸۴ھ کی تعمیر ہے جب کہ لاہور میں بہت زبردست راوی دریا میں طوفان اور بارش ہوئی تھی۔ یہ بند اس نے گاؤں محمود بوٹی کے قریب تعمیر کیا۔ اس سے لاہور بہت محفوظ ہو گیا۔ خاص کر وہ آبادی جو چاہ میراں اور بیگم پورہ اور باغبانپورہ وغیرہ دیہات میں تھی۔ اور یہی علاقہ لاہور اس وقت بہت آباد تھا۔ اسی طرح لاہور میں بعض دیگر عمارات بھی ہیں جن میں مقبرہ سلطان بیگ (یا دائی انگاہ) مقبرہ محترم جان محمد مقبرہ ہادی خاں اور مسجد بی بی پاکدامناں وغیرہ وغیرہ بہترین شاہکار

فن تعمیر عہد اورنگ زیب ہیں ان کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کسی قسم کا معیار فن ادنیٰ ہے۔

کشمیر

کشمیر میں مسلمانوں کا دور دورہ بحیثیت اسلامی سلطنت آٹھویں صدی ہجری میں ہوا۔ اور سلطان سکندر (۷۹۶ھ سے ۸۲۰ھ) کے عہد میں واضح طور پر ملتا ہے کہ ۸۰۱ھ میں یہاں ایک مسجد جامع تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد سری نگر میں فن تعمیر کا بہترین نمونہ تیار ہوئی۔ ممکن ہے اپنے خاص انداز تحریر میں جو ایسے مقامات میں جہاں پتھر کی بجائے لکڑی استعمال ہوتی ہے۔ کوئی اور عمارت اس کا خوبصورتی اور فنیت کی وجہ سے مقابلہ نہ کر سکے۔ اصحاب ماہرین فن کے لئے یہ ایک الگ موضوع ہے کہ جس پر ایک کتابچہ درکار ہے۔ مگر یہاں ہم اسی قدر کہتے ہیں کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ۱۰۸۴ھ میں اس میں ایک ایسی آگ لگی کہ یہ مسجد تو کیا بلکہ گردو نواح کے تمام مکان بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ غرضیکہ سکندر پورہ جل گیا جہاں یہ مسجد قائم تھی۔ یعنے اورنگ زیب کو ایک موقع ملا کہ وہ اس مسجد کو از سر نو تعمیر کرا کر اس امر کا ثبوت پیش کرے کہ اسے فنون سے کس قدر لگاؤ ہے۔ اور کہاں تک وہ ان کو سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے مصیبت زدگان میں سے ہر مکان کو از سر نو تعمیر کے لئے یک صد روپیہ فی گھر دیا اور جامع مسجد کی تعمیر بھی شروع کرا دی۔ انہیں سالوں میں ایران سے قوام الدین آیا ہوا تھا۔ اسے صوبیدار کشمیر مقرر کیا۔ اور ملا محمد طاہر نقشبندی کو تعمیر مسجد کی تعمیر پر مامور کیا تھا۔ اور اعلان کر دیا کہ جب تک یہ مسجد تعمیر نہ ہو جائے کسی معمار و مزدور کو دوسری جگہ کام کرنے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ تین سال میں تمام تعمیر کا کام ختم ہوا۔ بادشاہ نے محض قدیم طرز تعمیر کو برقرار ہی نہیں رکھا۔ بلکہ ضروری اضافے بھی کئے جن سے اس مسجد میں بہت رونق ہو گئی۔ اور محراب کے مینار گنبد نما کو پانچ ہزار اشرفی کے خرچ سے مطلا کیا۔ اور اس کے بام پر ایک میذنہ بھی اذان کے لئے بصورت مینار بنوایا۔ جس پر پہنچنے کے لئے تین سو زینے تھے جو آج موجود نہیں ہیں۔ اور

اردگرد کو دیگر خطرناک عنصر سے پاک کر دیا۔ جو کبھی پھر آگ لگنے کا باعث ہو سکتے تھے۔ اور اعلیٰ کتبات اسماء الٰہی سے محراب کو مزین کیا۔

بلکہ کشمیر سے آگے چل کر اسی عہد میں ہرات میں بعض عمارات کی دیکھ بھال کی گئی کیونکہ یہ حصہ بھی کسی قدر سلطنت مغلیہ کا بن چکا تھا۔ جس کا ثبوت اکثر کتبات سے ملتا ہے جو وہاں عمارات پر ہیں۔

احمد آباد گجرات کا ٹھیاواڑ میں احمد آباد بہت مشہور و معروف مقام ہے جس کی بنا ۱۴۱۰ء میں ہوئی تھی۔ اور ۱۵۸۰ء سے مغل بادشاہوں کی سلطنت کا حصہ ہو گیا۔ یہاں ہر عہد میں ضرور کچھ نہ کچھ عمارات بنتی رہی ہیں۔ مگر اسی اورنگ زیب کے عہد میں بے شمار عمارات تعمیر ہوئیں جن میں قابل ذکر مدرسہ نواب شجاع خاں ہے۔ جو ۱۱۱۳ھ میں قائم ہوا۔ یہ تمام عمارت مدرسہ اور مسجد خالص مغل طرز کے ہیں اور خوش قسمتی سے آج بھی نہایت عمدگی سے آباد ہیں۔ اور یہ کار خیر بہت ہی مفید کام کر رہا ہے۔ اگرچہ ایک اور ادارہ پیر محمد شاہ بھی اسی عہد کا ہے مگر یہ کسی قدیم عمارت پر قائم ہے۔ یہاں قدیم زمانہ سے ایک بہت عظیم الشان کتب خانہ بھی ہے۔

اگر ہم ذرا مزید تلاش کرینگے تو اورنگ زیب کے عہد کے آثار نو ساری بڑودہ، سومنات، جوناگڈھ۔ کھمبایت۔ میں بے شمار ملیں گے۔ بلکہ کلیان تک پھیلے ہوئے ملیں گے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ سورت عہد مغلیہ میں بحیثیت بندر حاجیاں بہت مشہور تھا۔ آج تک وہاں بعض قدیم خاندان سورت میں آباد ہیں جن کا فرض محض حاجیوں کی نگہداشت تھا۔ غرضیکہ گجرات میں اکثر مقامات پر آج بھی عمدہ عمارات موجود ہیں۔

وسط ہند علاقہ مالوہ میں ریاست دھار در اصل ایک بہت قدیم قلعہ ہے اور مشہور ہے کہ محمد تغلق نے اسے تعمیر کیا تھا۔ یہاں ایک مشہور درگاہ عبداللہ شاہ چنگال کی بھی ہے جن کی بہت سی کرامات لوگ بیان کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں دکن کی مہم کے لئے حملہ آور شمال سے اکثر ادھر

سے ہوکر گذرتے تھے۔ جہانگیر نے بھی اسے آباد رکھا۔ خاصکر جب کہ یہ مانڈو جانے کے لئے ایک بہت قریب راستہ ہے۔ اورنگ زیب نے اس کی چار دیواری کو مستحکم کیا جس پر ذیل کا کتبہ ہے

اللہ محمد

۱۔ بقلعہ داری عاشور بیگ پر تدبیر — کہ کوس ہمت او مشتری بچرخ نواخت

۲۔ بنظم مستقیم از بہر سال تاریخش — حصار و حارز دروازہ بلندی یافت

مطابق سنہ ۲۷ جلوس عالمگیر شاہی تواریخ ہجری در مصرع آخر است 'دیافت' برائے بیت است عاشور بیگ کوکہ زادہ شاہجہان بادشاہ۔

یہاں سے مانڈو قریب چھتیس میل ہے جو ایک پہاڑ پر ہے جس پر شاہان مالوہ نے نہایت شاندار عمارات تعمیر کیں۔ اور اس شہر کی ایک بہت اعلیٰ فصیل ہے۔ جس کا ایک دروازہ دہلی دروازہ کے نام سے آج بھی مشہور ہے اور اس کی تعمیر کسی صورت میں فن تعمیر کے اعتبار سے مغل عہد کی دیگر عمارات سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو فتح پور سیکری کے بلند دروازہ سے کم نہیں ہے۔ جس پر ذیل کا کتبہ آج بھی موجود ہے جس سے واضح ہے کہ ۱۰۷۹ھ کی تعمیر ہے۔

در زمان شاہ عالمگیر خاقان جہاں — از سر نو گشت برپا ایں در گردوں نشاں

در ہزار ہفتاد و نہ دہم انجام یافت — زہتمام خان عالیشاں محمد بیگ خاں

در جلوس ایں شہنشاہ جہاں اورنگ زیب — بود سال یازدہ از روی تحریر و بیاں

اورنگ زیب سے قبل یہاں سلاطین مغلیہ میں سے جہانگیر نے ان عمارات کی مرمت معمور خاں کے ذریعہ کرائی تھی۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے ایک دروازہ اور دیوار کی تعمیر سے اس قلعہ کو بیرونی آفات سے محفوظ کر دیا۔ یعنی اس کے دل میں یہاں کی قدیم عمارات کے اعلیٰ فن کا بھی

احترام تھا۔

سب سے بڑی چیز جو یہاں قابل بیان ہے وہ یہ ہے کہ چوبہ مسجد جو ہوشنگ شاہ کے مقبرہ کے صحن میں بڑی مسجد کے عقب میں ہے اس کے تمام اطراف دیوار سے گھرے ہوئے ہیں۔ اس کے اندر قبور ہیں۔ مقبرہ ہوشنگ غوری کے دائیں پہلو دروازہ میں ایک تانبے کے ٹکڑے پر ایک کتبہ ہے جس پر ذیل کے الفاظ کندہ ہیں :-

"بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی و خواجہ جادو رائے و استاد شیو رام و استاد حامد بجہت زیارت آمدہ بود دو کلمہ یادگار نوشت"

اس کتبے سے بہت سے واقعات کا انکشاف ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ معماران لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد، خواجہ جادو رائے۔ استاد شیو رام و استاد حامد دارالخلافہ سے بادشاہ کے حکم سے دروازہ متذکرہ بالا کی تعمیر کے لئے ۱۰۶۰ھ میں تشریف لائے تھے اور یہاں قریب آٹھ سال رہ کر انہوں نے یہاں ۱۰۶۸ھ تک یہ دروازہ مکمل کیا ہو۔ اور ابتدا میں یہاں کی قدیم عمارات کا خوب معائنہ کیا ہو۔ تاکہ معاملہ پیش کرنے کے بعد منظوری حاصل کر کے تعمیر شروع کی جائے۔ یا یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ لوگ محض فیضان حاصل کرنے کی غرض سے قدیم عمارات کو دیکھنے دور دراز مقامات پر جایا کرتے تھے۔ غرضیکہ یہ کتبہ اس ضمن میں بہت اہم ہے۔

گوالیار گوالیار ایک مشہور مقام راجپوتانہ میں شمار ہوتا ہے۔ خاص کر ابتدا فتح ہندوستان کے موقع پر یہاں مسلمانوں نے عمارات تعمیر کیں۔ بابر جب یہاں پہنچا تو اس نے یہاں ایک مسجد دیکھی جو شمس الدین التتمش کی تعمیر کردہ تھی کیونکہ اس نے اس پر ایک کتبہ بھی دیکھا تھا بابر نے اس کا اپنی توزک میں مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد تاریخ میں یہ قلعہ مزید اہمیت کا

مالک نظر آتا ہے۔ خاص کر اس کا اکثر فوٹو گراف جو برجوں وغیرہ والا نظر آتا ہے وہ عہد مغل کی یادگار ہے۔ مگر اسی زمانہ میں زیادہ اہمیت کا ذکر بطور زندان کے ملتا ہے۔ جو اس قلعہ کی ایک الگ حیثیت ہے۔ اسے ۱۰۸۱ھ میں عالمگیر نے اس کے دروازہ کی مرمت کرائی۔ اس کا ایک کتبہ اس کے دروازہ پر موجود ہے۔ اس عہد میں ۱۰۸۳ھ میں یہاں معتمد خاں نے قدیم تعمیرات کا احیا کیا۔ اور معتمد خاں کا ذکر یہاں اکثر کتبات میں موجود ہے۔ اور اس نے یہاں ۱۰۸۵ھ میں ایک مندر کو مسجد میں تبدیل کیا۔

دکن

ہم یہ پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنی عزیز عمر کے قریباً ۲۷ سال دکن میں دکنیوں سے متواتر جنگ میں گزارے۔ آخر ان کو پسپا کر دیا اور اسے سلطنت مغلیہ کا حصہ بنا دیا۔ اگر اس وسیع مملکت دکن کی تاریخ کا صحیح جائزہ لیا جائے تو ایک الگ ضخیم کتاب کئی جلدوں میں درکار ہو گی۔ مگر جب ہم محض اس کے عہد کی حد تک اور وہ بھی جو فنون تک محدود ہے تو بہت کم مواد ملتا ہے کیونکہ اس نے ایک تو یہاں جنگ میں وقت گزارا دوسرے یہاں اس قدر تعمیرات مختلف سلطنتوں میں اس عمدگی اور کثرت سے ہو چکی تھیں کہ زیادہ تعمیر کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم پھر بھی ضرورت کے اعتبار سے کافی عمارتیں وجود میں آئیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں میں حصول تخت و تاج کی جنگ کی ابتدا ہوئی تو اورنگ زیب مع اپنے بال بچوں کے دکن میں ہی مقیم تھا۔ یعنی ۱۰۶۸ھ تک یہیں تھا اور ۱۰۶۹ھ میں وہ باقاعدہ بادشاہ بن چکا تھا۔ مگر اس کے خاندان کا کچھ حصہ ابھی یہیں تھا۔ اس کی چہیتی بیوی رابعہ دورانی بیگم دلرس بانو بنت شاہنواز خاں سے نکاح ۲۳ ذی الحجہ ۱۰۴۳ھ کو آگرہ میں ہوا تھا۔ اس کا انتقال اورنگ آباد میں ۱۰۶۱ھ میں ہوا۔ محمد اعظم اور زیب النسا بیگم اس کے بطن سے تھے۔ اورنگ زیب نے اس کے مقبرہ کی تعمیر کا انتظام اپنے لڑکے کے سپرد کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ روضہ اورنگ آباد میں بالکل تاج محل آگرہ کے نقش قدم پر تعمیر ہوا درمیانی گنبد۔ چار مینار۔

باغ، دروازہ سب کچھ تاج کا نقشہ ہے مگر وہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں ہم اسے ایک ادنیٰ نقل کہہ سکتے ہیں اور اس روضہ کے دروازہ پر ذیل کے کتبات بھی پیتل کے ایک پترے پر موجود ہیں:۔

۱۔ ایں دروازہ باہتمام رفعت پناہ آقا ابوالقاسم بیگ داروغہ تیار شد۔

اور ساتھ ہی ذیل کا بھی ہے:۔

۲۔ ایں روضہ منورہ در معماری عطاء اللہ بہ عمل ہیبت رائے تیار شد ۱۰۷۱ھ

ہمیں تاریخ میں عطاء اللہ بن احمد معمار کا ذکر ملتا ہے۔ اس لئے گمان پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہی عطاء اللہ ہو۔ مگر اس کی کہیں تصدیق نہیں ہوتی۔ ساتھ یہ بھی ہے کہ عطاء اللہ رشدی بن احمد ہمیشہ اپنا تخلص اور اپنے نام کے ساتھ اپنے والد کا ذکر کیا کرتا ہے۔

ایک امر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد کے ابتدا سے ہی معیار فن میں فرق ضرور آگیا۔ جس کی یہ ایک بیّن دلیل ہے۔

ایک رقعہ عہد عالمگیری میں یوں ملتا ہے جس سے اس روضہ کا ذکر مقصود ہے۔

"درخجستہ بنیاد بزیارت نواب رابعۃ الدورانی تشریف خواہند برد و در آنجا متولی خواجہ واقف کار نیست آں عالی نسب والاحسب از ملازمان پادشاہی یا سرکار دولتمدار ہر کہ بنویسند بتولیت امتیاز خواہد یافت برائے مرمت روضہ وجای منزل آخرت ہمشیرہ میاں کان پیش مسجد قدیم قرار یافت لطیفہ آغاز یکہ بردن بروں روضہ عقب مسجد ند کور مدفون است آنچہ باید شکر اللہ معمار بفرمائید شاہزادہ بحضور سامی نسب مکرر از قلب خود قلمی مے نمایند چوں آں امر شد:

اورنگ آباد کے باہر مقبرہ کے مغرب کی طرف ایک معمولی سی بے آباد مسجد پڑی ہے جس سے راقم نے یہ کتبہ نقل کیا تھا۔ جو اورنگ زیب کا عہد ہے:۔

"این مسجد الماس از غلامان افضل خاں امانت خاں عاقل الشیرازی ۱۰۸۲

دکن میں اورنگ زیب نے کوئی خود خاص عمارت تعمیر نہیں کی ہاں یہ وہاں مشہور ہے کہ اس نے حیدرآباد کی مکہ مسجد کو ایک عاشور خانہ سے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ جس کی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اس مسجد میں کوئی باقاعدہ محراب مسجد نہیں ہے صاف دیوار ہے اور نہ مینار ہیں۔ بلکہ یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ یہ کام کر چکا تو کسی نے اسے کہا کہ اس تعمیر مسجد میں محراب اور میناروں کی کمی ہے تو اس نے مسکرا کر کہا

کار دنیا کسے تمام کرد ہر چہ گیرید مختصر گیرید

حالانکہ وہاں اس کی فتح سے پیشتر شیعہ حکومت تھی۔ مگر اس نے فوراً عنان حکومت لیتے ہی تمام عمارات کو اسی طرح قائم رکھا اور امن برقرار کیا۔ ہاں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ دوران جنگ ممکن ہے کچھ تخریبی اقدامات بھی رونما ہوئے ہوں۔

۱۰۹۷ھ کے واقعات کے تحت مآثر عالمگیری میں ملتا ہے کہ شاہزادہ شاہ عالم بہادر نے حیدرآباد کو فتح کیا جس کی تاریخ یوں درج ہے۔

بیجاپور جو کبھی سلاطین عادلشاہیوں کا پایۂ سلطنت تھا۔ جہاں وہ وہ عمارات تعمیر انہوں نے اپنے ترکی نژاد کاریگروں کی معرفت کرائیں کہ آج دنیا میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ خاص کر وہاں ابراہیم کا روضہ اور اس کی مسجد مگر سب سے بڑھ کر محمد عادل شاہ کا روضہ جو آج دنیا میں گول گنبد کے نام سے مشہور ہے دنیا میں سب سے بڑا گنبد شمار ہوتا ہے۔ اور اس میں گونج کا بھی پورا انتظام ہے۔ اورنگ زیب نے اسے ۱۰۹۶ھ میں فتح کیا۔ اور یہاں کی عمارات کو خوب عمدگی سے برقرار اور آباد رکھا۔ اس ضمن میں یہاں کا اثار محل قابل ذکر ہے۔ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا میں واحد عمارت ہے۔

اور اکولا برار میں اس کے عہد میں عیدگاہ ۱۱۱۶ھ میں خواجہ عبداللطیف نے تعمیر کرائی اور قلعہ

اسدگڑھ کو ۱۱۱۴ھ میں مکمل کیا گیا۔

اسی طرح گلبرگہ میں اورنگ زیب نے ۱۱۰۵ھ میں بعض عمارات کی مرمت اور تجدید کی جن پر آج تک کتبات محفوظ ہیں۔

گلبرگہ صوبہ ہائے متحدہ میں بھی اکثر مقامات پر اورنگ زیب نے خود اور اس کے عہد میں دیگر امرائے کبار نے بہت اعلیٰ اعلیٰ عمارات تعمیر کیں جو قابل ذکر ہیں۔ ان میں خاص کر بنارس کی مساجد ہیں جن کا الگ بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ضلع میں آج تک سرائے گھاٹ کے نام سے مشہور ہے جس پر کتبہ ۱۰۹۷ھ کا ہے۔ اعظم گڈھ کے قریب گنجرہ میں مسجد ۱۰۹۹ھ میں تعمیر ہوئی جو محمد صالح کی مسجد ہے۔ بدایوں میں ۱۰۹۲ھ میں تعمیر ہوئی جو آج قادریہ سکول میں موجود ہے۔ جسے شیخ افضل نے تعمیر کیا تھا۔ فتح پور جو بہت مشہور مقام ہے وہاں آج تک دو قبور عبدالصمد اور اس کے لڑکے ابو محمد بن عبدالصمد کی ہیں جو ۱۱۱۱ھ اور ۱۱۱۶ھ میں تعمیر ہوئیں۔ ضلع قنوج میں فتح آباد میں شیخ مہدی بن شیخ کبیر بالاپیر کی مسجد جو ۱۰۶۸ھ کی ہے۔ پھر ان کے والد شیخ کبیر جسے محمد بن اسلم نے تعمیر کرایا تھا اور اندرون دروازہ موجود ہیں۔ مگر یہاں ۱۰۹۴ھ کی تعمیر کردہ سرائے ہے۔ صوبہ ضلع حمیر پور میں قلعہ کے اندر ۱۱۱۳ھ میں قلعہ تعمیر کروایا۔ کالنجر صوبہ متحدہ میں قلعہ کی مرمت ۱۰۸۴ھ میں کرائی بلکہ روڑکی سے نکل کر ڈیرہ دون تک بعض عمارات کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا بعض خانقاہیں ہیں۔ غرضیکہ یہ وہ کارنامے ہیں جن سے قدیم عمارات کو مرمت وغیرہ کر کے محفوظ بھی کیا گیا ہے۔

بنگال اورنگ زیب کے حالات میں بنگال کا ذکر ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ علاقہ مرکز سے بہت دور تھا تاہم انتظام ملکی کے اعتبار سے تمام امور نہایت عمدگی سے رہے۔ ۱۰۹۵ھ میں ڈھاکہ میں بی بی پری صبیہ شائستہ خاں کا روضہ تیار ہوا۔ مقام گور میں بعض عمارات تیار ہوئیں۔ جن پر کتباب ۱۰۷۸ھ کے ملتے ہیں۔ اور بنگال کا قدیم مقام پیڈو میں عمارات اس

عہد میں تعمیر ہوئیں۔ جن میں قابل ذکر مزار شاہ جلال کی مرمت ہے جسے شاہ نعمت اللہ نے ۱۰۷۵ھ میں کرایا۔ وہیں ایک عمارت ان بزرگان کے اعزاز میں ۱۰۷۵ھ میں تعمیر ہوئی اور یہی سلسلہ اس عہد میں ۱۰۹۲ھ تک نظر آتا ہے۔ اور مونگیر میں ایک مسجد ۱۰۷۴ھ میں ولی بیگ کلاب نے تعمیر کرائی۔ اور حاجپور کی مسجد ۱۰۹۸ھ میں نصر اللہ خاں کے ذریعہ وجود میں آئی۔

پٹنہ میں عہد اورنگ زیب میں خاصی عمارات تعمیر ہوئیں جن میں مسجد درگاہ قابل ذکر ہے۔ جو ۱۰۷۰ھ میں ہوئی۔ ارھائی کنگرہ مسجد جو پٹنہ کے باہر ہے ۱۰۷۳ھ میں ہوئی۔ دیوان انصاف کو جعفر خاں نے ۱۰۷۴ھ میں بنوایا تھا۔ جیسا کہ شعر ذیل سے ظاہر ہوتا ہے:۔

بہر عدل و داد مظلوماں ز دست ظالماں
ساخت دار العدل جعفر خاں بندہ داؤد خاں

اور روضہ مسجد ۱۰۷۸ھ میں وجود میں آئی جہاں بے شمار قبور ہیں اور اس پر ذیل کا کتبہ بھی ہے:۔

آراست مسجد از پے خوشنودگی خدا — از راہ اعتقاد شہنشاہ کامراں
تاریخ او خود ہزاراں نیاز گفت — بر پا نمود کعبہ حاجات در جہاں

جو باہتمام امین احمد تیار ہوئی۔ اور اسی طرح عنبر مسجد جسے خواجہ عنبر نے تعمیر کروایا تھا جو شائستہ خاں صوبہ دار بہار کا وزیر تھا اور یہ ۱۱۰۰ھ میں تیار ہوئی ؎

خواجہ عنبر ناظر شائستہ خاں — مسجد نو ساخت چوں بیت الحرام
مظہر الحق سال تاریخ بنائش — معدن فیض الٰہی زور قسم

ان کے علاوہ بزرگ امید خاں کی مسجد بھی اسی علاقہ میں ہے جو ۱۱۱۴ھ میں وجود میں آئی پٹنہ سے متعلق یہ تمام اطلاع بہار ریسرچ سوسائٹی پٹنہ کے مجلہ ۱۹۳۰ء سے ماخوذ ہے۔

اس مختصر بیان متعلق تعمیرات اسلامی بعہد اورنگ زیب درج کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر

پہنچتے ہیں کہ اس کے عہد میں عمارات نہایت عمدگی سے ہر انواع کی تعمیر ہوئیں۔ اور ان کے معیار میں وہی فراوانی رہی جیسا کہ بادشاہی مسجد لاہور سے عیاں ہے اور ہر طرح عمارات سلاطین سلف کی مرمت بھی ہوئیں اور بلکہ ان کے تحفظ کے لئے تدابیر بھی کی گئیں جیسا کہ لاہور میں محمود بوٹی کے قریب راوی پر بند بنوایا گیا۔

تاج محل بعہد اورنگ زیب

اورنگ زیب ۱۰۶۸ھ سے سریر آرائے سلطنت ہوا جب شاہجہاں کو آگرہ کے قلعہ میں جاگزین ہونا پڑا۔ اور وہیں شاہجہان کا دیوان خاص میں تاج محل کو دیکھتے ہوئے ۱۰۷۶ھ میں انتقال ہوا مگر اورنگ زیب ابھی شاہزادہ ہی تھا اور تاج محل ابھی ابھی پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ اور اسے آگرہ میں مقیم ہونے کا اتفاق ہوا اور شاہجہاں غالباً کشمیر میں تھا۔ اس زمانہ میں آگرہ میں بارش بہت زور سے ہوئی تو بعض تعمیری امور تاج کے اس کے مشاہدہ سے گزرے جس کے بعد وہ اپنے باپ کو لکھتا ہے:۔

"جمعہ کے روز روضہ مطہرہ کا طواف کیا۔ زیارت کی برکتیں جو سراپا اطاعت تھیں حاصل کیں۔ اس پاک بنیاد والے مقبرہ کی عمارتیں اسی دستور کے موافق جو حضور پُرنور نے تمام کی تھیں استوار ہیں۔ لیکن مرقد پاک کا گنبد شمالی جانب سے برسات کے موسم میں دو جگہ سے ٹپکتا ہے۔ اور اسی طرح سے چاروں پیش طاق اور دوسرے درجہ کا شاہ نشین اور چار چھوٹے گنبد اور بڑے گنبد کے کچے کوٹھے کی پشت بھی دو تین جگہ سے اسی فصل میں ٹپکی تھیں۔ دیکھئے آئندہ سال کیا ہوتا ہے۔ مسجد کے گنبد اور جماعت خانے موسم بارش میں ٹپکتے ہیں۔ اور ان کی مرمت کر دی گئی ہے۔ معمار لوگ بتاتے ہیں کہ اگر درجہ دوم کے کوٹھے کے فرش کو علیحدہ کر کے ریختہ کریں اور ریختہ کے اوپر آدھ گز کی تہ کاری کر دی

جائے تو شاید پیش طاق، شاہ نشین اور چھوٹے گنبد ٹھیک ہو جائیں۔ بڑے گنبد کی تدبیر میں عجز کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس قسم کی عمارتوں کو نظر بد لگ گئی ہے۔ اگر توجہ اقدس کا پرتو ان کے دفعیے کے علاج کی طرف برسے تو بجا ہوگا۔"

اورنگ زیب کے اس متذکرہ بالا خط سے اس کے ادراک فن تعمیر پر خاص روشنی پڑتی ہے کہ اس نے کس قدر باریک بینی سے روضہ کا معائنہ کر کے اپنے والد کو اطلاع دی جو بذات خود بہت بڑا ماہر فن تعمیر تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ اس نے ایک مرتبہ مذہبی نگاہ سے تاج کی تعمیر پر تبصرہ بالفاظ ذیل کیا تھا جو ایک خط میں بنام فرزند ملتے ہیں :۔

"فرزند عالیجاہ ..... حفظ اللہ۔ عمارت مقبرہ شاید جائز نباشد۔ در اسراف خود سخن نیست واستعمال آہک بر قبر نیز منع است ....."

مگر وہ اور صورت ہے بلکہ یہ بھی اس کے ادراک فن اور فن سے دلچسپی کے منافی نہیں۔ مآثر عالمگیری و دیگر مآخذ کے مطالعہ سے ہمیں وضاحت سے ملتا ہے کہ اس کے عہد میں بھی ممتاز الزمانی کا سالانہ عرس ۱۷ ذیقعد کو حرمہ کی تاریخ وفات کو برابر سرکاری طور پر ہوتا رہا۔ اس کے لئے جو رقم شاہجہاں کے زمانہ سے مقرر تھی اس میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دی۔ بلکہ بعض موقعوں پر جب اس نے اس کی زیارت کی تو مجاوروں اور محتاجوں کو جو بھی روضہ میں نظر آیا یا مقیم تھے خاصی رقوم عنایت کیں اور ہمیشہ حفاظ مدرسین کا وہیں انتظام رہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب اس کی اپنی چہیتی بیوی رابعہ دورانی دلرس بانو کا انتقال ہوا تو اس کے روضہ کو بھی اورنگ آباد میں ویسا ہی بننے کے لئے خواہش ظاہر کی۔ جو اگرچہ معماری میں ادنے ہے جسے الگ یہاں دکن کی عمارات کے تحت بیان کر دیا گیا ہے۔

غرضیکہ ان حالات میں ہم اورنگ زیب کے ذوق فنون اور دلچسپی فنون پر حرف گیری نہیں

کر سکتے اور نہ مذہبی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے۔ تاج محل کی عمارت کے مجرے کے اندر ہشت پہلو حلقہ کا نقشہ ملاحظہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ دراصل محض ایک قبر کے لئے اوّل تعمیر کیا گیا ہے جیسا کہ عین مرکز میں قبر کا تعویذ ممتاز الزمانی والدہ اورنگ زیب کا ہے اور مرکز سے ہٹ کر ایک اور تعویذ اس کے والد شاہجہاں کا تعویذ ہے اور یہی صورت سرداب میں زیر زمین ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعویذ فنّی حیثیت سے ایک ہی وقت میں اور ایک ہی کاریگر نے بنائے ہیں حالانکہ دونوں میں قریب بیس پچیس سال کا فرق ہے۔ کیونکہ شاہجہان کو یہاں ۱۰۷۶ھ میں اس کی وفات پر دفن کیا گیا۔ دونوں تعویذوں کی پرچین کاری وغیرہ سب ایک ہی ہاتھ کا کام معلوم ہوتا ہے۔ اور مؤخر الذکر سب اورنگ زیب کا اپنا کام ہے اور اس کی ہمشیرہ جہاں آرا بیگم صاحب کا بھی دخل ہے مگر کام بادشاہ کے حکم اور اختیار سے اختتام کو پہنچا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہ جہاں کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا مقبرہ الگ جمنا دریا کے سامنے کنارے پر تاج محل کے عین مقابل تعمیر کرے مگر اسے اس کی توفیق نہیں ہوئی۔ اورنگ زیب کے سامنے بے شمار سیاسی امور سلطنت و انتظام حکومت تھے ورنہ وہ یہ بھی پورا کرا دیتا۔ بہرحال اس نے ماحول و ترتیب اور ترکیب، منظر، یکسانیت ضرور پیدا کر دی۔

اورنگ زیب کے عہد کے بعد تاج محل کا ذکر بہت کم تاریخ میں ملتا ہے۔ کیونکہ ملک کی سیاسی فضا بالکل بدل گئی تھی۔ حتّٰی کہ برٹش کا زمانہ آگیا اور آج ہندوستان کا قبضہ ہے۔ یہ خدا کی شان ہے۔

اورنگ زیب کے عہد میں، جہاں تک فن تعمیر کا تعلق ہے، زیادہ تر یہی نظر آئیگا کہ رعایا کے تحفظ کے لئے ملک کو اور پرانی عمارات کو شکست ریخت سے بچانے کے لئے اکثر مرمت اور ان کے تحفظ کے لئے زیادہ تدابیر کی گئی ہیں۔ اس لئے اس بحث کو نہایت مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔

بنیاد قیام نمایند۔ دریں باب تاکید دارند۔ بتاریخ ۱۸ شہر جمادی الثانی سنہ ۱۰۶۹ھ نوشتہ شد۔

مندرجہ بالا فرمان کے متعلق عرض ہے کہ یہ سب سے پہلے ایک مشہور مستشرق کرنل ڈی سی فلٹ نے شائع کیا اور اس نے اس کو اصلی حالت میں دیکھا بھی ہے۔ اور اب تک بنارس کے گوپی اپادھیا نامی برہمن کے قبضہ میں ہے۔

سنہ ۱۰۶۹ھ کے واقعات میں ملتا ہے کہ بنارس سے اطلاع آئی کہ بت خانہ بالکل منہدم کردیا گیا ہے اور سنہ ۱۰۸۰ھ میں بادشاہ نے پابندی احکام الٰہی کا لحاظ فرما کر متھرا کے بت خانہ کے انہدام کا حکم صادر فرمایا۔ یہ بت خانہ جو ایک عالیشان عمارت تھا کارپردازان سلطنت نے تھوڑے عرصہ میں اسے زمین کے برابر کردیا۔ اور اس کی جگہ رقم کثیر صرف کرکے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی۔ متھرا کا یہ مندر جو ڈیرہ کیسو رائے کے نام سے مشہور تھا جہانگیر کی عنایت سے نارسنگھ دیو بندیلہ سے تعمیر ہوا تھا۔ اس نے شیخ ابوالفضل جیسی جلیل القدر ہستی کو شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے حکم سے قتل کردیا تھا۔ اور اس کے عوض میں اس نے اس نارسنگھ کو یہ مندر بادشاہ ہونے پر ۳۳ لاکھ روپیہ کے خرچ سے تعمیر کرکے دیا تھا۔ میرے خیال میں اورنگ زیب کے سامنے محض یہی خیال تھا کہ ایک عبادت خانہ کی بنیاد تاریخ میں اس طرح ہرگز نہیں رہنی چاہئے جو کسی کے قتل کا انعام قاتل کے لئے ہو اور پھر اس ہستی کے لئے جس پر ہندو مسلم دونوں فخر کرتے ہوں۔ ابوالفضل جیسے فاضل کو جس نے بے شمار کتب تصنیف کیں اور سنسکرت زبان سے فارسی میں ترجمہ کیں ہندو بہت اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر یہ تھا کہ وہ اپنے جد امجد جہانگیر کے لئے بھی یہ مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ تاریخ میں اس پر ایسا دھبہ رہے۔ بلکہ اس بت خانہ کے تمام خورد و بزرگ اصنام اکبرآباد میں لائے گئے اور نواب قدسیہ بیگم کی تعمیر کردہ مسجد کے زینوں کے نیچے دفن کردئے گئے۔ شہر متھرا اسلام آباد کے نام سے پکارا اور لکھا جانے لگا۔ (مآثر عالمگیری ص ۶۵)

اودے پور کے منار کے متعلق مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ فن کے اعتبار سے یادگار روزگار تھے۔ اور یہ رانا کے محل کے گرد و نواح میں تھے۔ (مآثر ص۱۸۶) اسی بت خانوں کو بھی مسمار کر دیا گیا۔ اور بیدر دکن اور مدراس کے بت خانوں کا انہدام کتبوں سے بھی ثابت ہے۔ جہاں ان کی جگہ مساجد اب تک قائم ہیں۔ بیدر کا کتبہ یہ ہے :۔

مسجد تعمیر کردہ اورنگ زیب عالمگیر

واقع بیرون دروازہ محمود گنج المعروف بہ منگل پیٹ

چو ہمت والا نہمت خدیو دین پناہ مویّد من عند اللہ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی بر انہدام بنیان کفر و ظلام و تاسیس اساس دین اسلام مصروف و معطوف است کمترین بندگان مختار خاں الحسینی السبزواری ناظم صوبہ ظفر آباد بتخریب بتخانہ و ترتیب تاسیس مسجد و باغ پرداخت بتاریخ بیست و پنجم شہر ربیع الاوّل سنہ ۱۴ جلوس ہمایوں موافق سنہ ۱۰۸۲ ہجری نبوی مطابق این مصرعہ تاریخ آمد :۔

"بت کدہ مسجد شدہ از لطف حق"

بعنایت ملک علام صورت اتمام یافت از غایت خوبی و دل نشینی بہ باغ فرح موسوم گردانید۔ بفرزند دلبند از عمر و دولت برخوردار میرزا نجم الدین محمد خلف فرزند سعادتمند میرزا قمر الدین متعلق ساخت ؎

بنا کردہ مسجد جائے کنشت برا بوالبشر انا فتحنا نوشت

(کتبہ قمر الدین محمد بن مختار خاں)

اسی طرح بڑی کانجی درم (مدراس) میں عیدگاہ پر داؤد خاں پنی کا ایک کتبہ شاہنشاہ اورنگ

ف۱ منتخب الباب ص۲۵۲

زیب عالمگیر کے عہد کا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ بت خانہ منہدم کر کے عید گاہ تعمیر کی گئی ۔ بڑے مندر کے سامنے غضنفر خاں نے ایک مسجد بت خانہ کو توڑ کر تعمیر کی جس پر بیت ذیل کندہ ہے ؎

آں خان غضنفر جگر دشمن کاہ　　مسجد آراست نقش بت کردہ تباہ

مآثر عالمگیری کے مطالعہ سے ملتا ہے کہ ۱۰۸۹ھ میں داراب خاں جو شاہی حکم کے مطابق کھنڈیلہ کے شورہ پشتوں کی تنبیہہ اور بت خانوں کو منہدم کرنے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ وہ ۵ر صفر کو واپس ہوا۔ ایک سو راجپوتوں نے اس کا مقابلہ کیا مگر سب ہلاک ہوئے۔ غرضیکہ تمام مندر زمین کے برابر کر دئے گئے اور اسی سال میں ربیع الآخر کے مہینہ میں خان جہاں بہادر جودھپور کے بت خانوں کو منہدم کر کے آستانہ شاہی پر حاضر ہوا۔ ایک دفعہ ۱۰۹۰ھ میں بادشاہزادہ محمد اعظم اور خان جہاں بہادر کو اودے پور دیکھنے کی اجازت ہوئی۔ اور روح اللہ خاں اور دیگر تازخاں وہاں کے بت خانہ کے مسمار کرنے پر متعین ہوئے جو رانا کی حویلی کے سامنے واقع تھا۔ راجپوتوں نے خوب مقابلہ کیا اور کافی لوگ تہ تیغ ہوئے۔ سرکاری فوج بھی کام آئی آخر بت خانہ توڑ دیا گیا۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تناقض کیوں ہوا۔ ایک طرف تو فرمان امتناع انہدام مناور اور دوسری طرف اس کے خلاف عمل ہوا۔ اگر ان تمام واقعات کو ذرا قلب وسیع سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام واقعات سیاسی تھے نہ کہ ذاتی عناد تھا جیسا کہ لین پول کے بیان کردہ ست نامیوں وغیرہ کے واقعات سے ثابت ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ معابد ہی ان کی سیاسی مجلس گاہیں تھیں۔ ایسے سیاسی امور ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور حکومت محض امن عامہ اور تحفظ کو مدنظر رکھ کر مفسدین کے کسی جذبات کی پرواہ

نہیں کرتی جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کے فسادات رولٹ ایکٹ کے ضمن میں ہندو مسلم مل کر لاہور کی شاہی عالمگیر کی مسجد میں جلسے کرتے تھے تو گورنمنٹ نے اس کو نعوذ باللہ جائے فساد سمجھ کر کئی ماہ کے لئے بند کر دیا اور کسی کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ وفود کی سماعت کے بعد ان کو ذمہ دار ٹھیرا کر مسجد کو کھول دیا۔ مقبرہ مہدی سوڈانی کی تخریب بھی ہماری یادداشتوں میں ہے۔ علاوہ ازیں ہم اس زمانہ میں دیکھتے ہیں کہ حجاز میں سلطان ابن سعود نے ہزارہا سال کے آثار متبرکہ کو محض خلاف شریعت دیکھ کر پیوند خاک کر دیا حالانکہ بادشاہ مسلمان اور مسلمانوں کے آثار ہیں صورت یہ ہے کہ ان کے نزدیک عقیدۃً یہ عبادت الٰہی میں حائل تھے۔ اور اس ابتدائی فن اسلام کی تباہی پر کسی کو چوں کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ غرضیکہ یہ امور ہر وقت دنیا میں کام کرتے رہتے ہیں۔ جنگ عظیم یورپ کے دوران میں اکثر واقعات ملتے ہیں کہ گرجوں پر گولہ باری کی گئی اور ان کو مورچہ بنایا گیا مگر کبھی شکایت تک نہیں سننے میں آئی۔ کیونکہ یہ سب سیاسیات پر مبنی تھا۔

تفصیل سے دیکھا جائے تو عہد اورنگ زیب میں ہندو و دیگر غیر مسلم معبد بے حد تھے اور وہ از روئے عبادت ہی قابل لحاظ نہیں ہیں بلکہ وہ فنی اعتبار سے آج دنیا بھر میں بے مثل ہیں۔ جیسا کہ ان میں سے سومنات، جگن ناتھ، مدرا کے منادر، بنارس کے منادر وغیرہ وغیرہ۔ بیدر میں ایک مندر خانہ پور میں ہے جو قریب دس میل کے فاصلہ پر بیدر سے ہے۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اورنگ زیب نے بنوا کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مسجد بھی ہے ادھر فرح باغ کا دیول کو منہدم کر کے مسجد کو تعمیر کیا جاتا ہے جو وہاں کے کتبہ سے عیاں ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہاں کے منادر کے مہنتوں کے مابین کچھ جھگڑا تھا اور ان میں سے ایک نے بادشاہ کی مدد سے دوسرے کو بھگا دیا جیسا کہ فرح باغ کے پہاڑ کی کھو میں وہ دوڑتا ہوا بتایا جاتا ہے۔ اور اس کے اندر ایک مورتی ہے جس کا منہ پہاڑ کی دیوار میں ہے اور صرف پیٹھ نظر آتی ہے۔ اگر اورنگ زیب کو

ایک مندر کا گرانا ہی مقصود تھا تو دوسرے کا بنانا کیا معنی۔ عثمانہ آباد میں تلجاپور بھوانی کا دیول۔ گولکنڈہ کے راستہ میں جھام سنگھ کا دیول۔ مومنہ آباد میں امبہ جوگائی کا دیول وغیرہ وغیرہ یہ سب دیول اورنگ زیب کے فرمان رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ جاگیریں ہیں اور معافیاں ہیں۔ بالخصوص تلجاپور کے دیول کے دروازہ پر آج تک اورنگ زیب کا فرمان ثبت ہے جو دی ہوئی معافیوں کا ذکر کرتا ہے۔

"مقام گیا میں ۱۹۳۲ء میں کانگریس اور ایجوکیشنل کانفرنسیں منعقد ہوئی تھیں۔ گیا بدھ مت کا سب سے بڑا مقدس ترین اور قدیم ترین معبد واقع ہوا ہے۔ اس موقع پر سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنے معارف جنوری ۱۹۳۰ء میں ایک شذرہ سپرد قلم کیا تھا۔ جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

اس معبد کے کاغذی خزانہ میں ہندو مسلم رشتہ اتحاد کا سب سے بڑا انمول موتی رکھا ہے۔ یعنی متعصب ہندو کش عالمگیر کی سند جاگیر جو اس نے اس غیر اسلامی معبد کو عطا کی تھی اور جس کی بدولت اس مندر کے مصارف روزینہ کا سامان ہے"۔

یہ سب اورنگ زیب کے دلدادہ فن اور جذبہ احترام معبد غیر مسلم پر دال ہیں۔

آپ ایلورہ غاروں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے جائیں تو وہاں آپ بدھ مت کے غار ہا ملاحظہ فرمائیں گے۔ مگر وہاں آپ کو بھاٹ ملیں گے جو بلاکم و کاست آپ کے سامنے وہاں کی تفصیل نہایت جلدی جلدی بیان کریں گے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بیان ہوگا کہ حضرت عالمگیر نے ان تمام غاروں کو آگ جلا جلا کر خراب کر دیا ہے۔ جو بالکل واقعات کے خلاف ہے اور سیاح سمجھتے ہیں ٹھیک ہے اور یہی تصور لے کر جاتے ہیں۔ اور جسے پھر وہ تحریر میں لاتے ہیں۔ میں آپ کے سامنے ان غاروں کی تفصیل مآثر عالمگیری سے پیش کرتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہوگا

کہ مؤرخ عالمگیران کو کس نگاہ و احترام سے دیکھتا ہے اور الفاظ ذیل میں یوں بیان کرتا ہے:۔

"..... دولت اباد ..... از انجا بمسافت کمی الورہ نام جائے است کہ سابقاً بغراوان اعوام در شعاب جبال نقابان سحر کار بطول یک کروہ خانہائے رفیع بنیان کنداند و در تمامی اسقاف و جداراں آں تمثالہا گوناگوں و بصورت درست تراشیدہ بالای کوہ ہموارے نماید گوئی از خانہا نشانے نمودار نیست و از منہ سابقہ کہ کفار اشرار بداں دیار دست داشتند ہماناں کہ بانیٔ ایں منازل علی اختلاف الروایات آنہا باشند نہ جن معبد قوم باطل ستیز بود۔ اطال خرابہ ایست مستقیم بنیان غیرت جای عاقبت بنیان در جمیع موسم خاصہ برسات کہ آں کوہ و صحرا از شادابی سبزہ و سیرابی نمودار باغ میگردد و آبشاری بعرض صد گز مے افتد مردم بتماشا می روند۔ بدیع سیرگاہ است نظر فریب جز بدیدن تحریر ماہیت راست نیاید خامہ تا کجا اخبار برآراید"

یہ تو الفاظ اس مؤرخ کے ہیں جس نے اپنی تاریخ میں بلا تامل دیگر مناظر وغیرہ کے انہدام کا ذکر کر دیا ہے۔ اگر ان کے ساتھ بھی کوئی سلوک ہوتا تو وہ ضرور تحریر کرتا۔ بلکہ اس کے بعد اورنگزیب عالمگیر کی اپنی تحریر ملاحظہ ہو کہ وہ خود کیا ان کو سمجھتا ہے اور صحیح فن کا مذاق اس کے اندر کس قدر ہے اور اس کی توقیر کس قدر کرتا ہے۔ یہ ایک رقعہ ہے جو وہ اپنے فرزند کو لکھتا ہے اور اس قدر جامع اور مانع ہے کہ اورنگ زیب کے ہمہ اوصاف فنون پر حاوی ہے:۔

"بفرزند زادہ بہادر بنویسد کہ قصبہ ستارا شکارگاہ ما بود نزدیک چشمہ نہاد ست در آنجا بالای کوہ بت خانہ بود بنام کہاندیواری بفضل الٰہی انداختہ شد و مرمہائے کہاندیو از خواہش منع شد الحال چہ خبرست دیگر بنویسد کہ در صوبہ دکھن و بودن در دولت آباد و خجستہ بنیاد کہ بنیاد کردہ ایں خالی است بعد از آبادی اوّل کہ کہکی نام داشت و برائے

دغدغہائے و وسوسہائے شیطانی ونفسانی مشق وقطرہ ویلغار ازنادانی میکردیم و شکار نیلہ گاؤ وغیرہ دور دست بود بسواری اسپ میرفتیم و برزہ کاری میکردیم ۔ حوض قتلو وآب پاسی ورہ چار ٹیکری وجتوار او زیارت شیخ برہان الدین و زین الدین وبالا فن قلعہ دولت آباد وایلورہ کہ از عجائبات صنع صانع حقیقی است بجا نہ میگشتم ۔ چہ بامردم محل وچہ بچل اگر رفتن بقلعہ اتفاق نمایند فرمان بنام قلعہ دار بفرستیم کہ این اکمنہ را دیدہ حقیقت بنویسند واز حقائق مساجد بناکردہ حال وسابق برگذارند ملاقات درویشی کہ خدمت گذار خاں میداند ۔ اگرچہ جوانست امر تاضی است خواہند بکشد و سلام میرساند ۔ وفاتحہ فاتحہ سلامت ایماں بخوانند نظر بر کریمہ فی قلوبہم مرضٌ وعا صلاح واصلاح فرزنداں کردہ مے شود ۔ چوں از سلب کفار انبیا واولیا آمدہ اند چہ عجب کہ از سلب ملاحی صالحی برآید اما کشش وجزبہ اگرچہ ناگاہ آید لیکن بر دل آگاہ آید این کار دولتست کنوں تا کرا رشد "۔

اب اس ایک رقعۂ عالمگیر سے حاضرین پر کس قدر جامعیت سے واضح ہو چکا ہے کہ وہ کس قدر فنون لطیفہ کا حامی تھا اور خود خوب خط اُٹھاتا تھا ۔ بلکہ اس کا اظہار تحریر میں بھی اسی شان سے کرتا تھا جو بذات خود فنون لطیفہ کا حصہ ہو جاتا تھا ۔ اور اس ایک رقعہ میں کس قدر چیزیں آگئی ہیں ۔ بلکہ اگر صحیح طور پر مجھ سے پوچھا جائے تو اس تمام مضمون کا اگر خلاصہ ہو سکتا ہے تو یہ ایک تحریر اس کی طرف سے کافی ہے ۔

مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے جب ایک شخص کو بلا قصور محض تعصب کی بنا پر بدنام کرنا ہی مقصود ہو ۔ اس کے بعد مزید ایک اور بیرونی شہادت ملاحظہ ہو کہ ہندوستان میں اورنگ زیب کے عہد میں ایک یورپین بت شکن آیا تھا جس نے سیاحت مشرق خوب کی ۔ اس کے متعلق دلگداز لکھنو

اگست ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون بصدق میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا" مولوی عبدالحق صاحب کا بعنوان "ایک بت شکن یورپین" شائع ہوا جس کو ذیل میں درج کرتا ہوں :۔

"کچھ اوپر دو سو برس کا زمانہ ہوتا ہے کہ ایک اٹالین ڈاکٹر گیملی گریزی نامی بغرض سیر و سیاحت ہندوستان میں پہنچا۔ اگرچہ اس کا یہاں آنا خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ہوا لیکن سفر کا شوق اسے پہلے سے تھا۔ چنانچہ ۱۶۸۳ء میں یورپ تک ہی کی سیر کی اور بعد ازاں دنیا بھر کا چکر لگایا۔ غرض وہ مصر، فلسطین، روم و ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا۔ اصفہان میں اسے شاہی دربار میں بھی باریاب ہونے کا موقع ملا اور وہاں اس نے علاوہ دیگر سفرائے غیر ممالک کے شہنشاہ اورنگ زیب کے بیٹے محمد اکبر کو بھی دیکھا جس نے بھاگ کر شاہ ایران کے دربار میں پناہ لی تھی۔ ہندوستان میں اگرچہ کچھ دنوں پرتگیزیوں کے علاقہ گوا میں رہا اور اس کے بعد اس نے اندرونی ملک کا سفر شروع کیا۔ اس کا یہ سفر تاریخی لحاظ سے بھی بہت دلچسپ ہے۔ ۵ مارچ ۱۶۹۴ء کو وہ گوا سے اس نیت سے روانہ ہوا کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں حضوری کی عزت حاصل کرے۔ شہنشاہ اس وقت مع لشکر کے گلگلا میں خیمہ زن تھے۔ اس سفر میں اس نے رستہ کی تکلیف اور باربرداری کی شکایت کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ یہ تکلیف صرف بیجاپور کے نواح میں ہے "جو آج کل عرصہ جنگ و جدل بنا ہوا ہے" لیکن سلطنت کے شمالی حصوں یعنی احمد آباد اور سورت کے قریب راستے بہت پُرامن ہیں جہاں کسی قسم کا خوف و اندیشہ نہیں ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان سے جانے کے بعد جب وہ سفر یورپ میں مصروف تھا جاسوس سمجھ کر قید کر لیا گیا۔ اور اس کی عمر کے آخری دن قید میں گذرے۔ تو اس کا بہ آسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کا سفر کیسا پُرامن تھا کہ غیر ممالک کے لوگ بلا خوف و خطر ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیر و سیاحت کر سکتے تھے۔ راستہ میں اس نے ایک عورت کو

ستی ہوتے بھی دیکھا اور اس کی پوری کیفیت اس نے اپنے سفرنامے میں بیان کی ہے۔ اور جو تکلیفیں راستہ میں اسے پہنچیں وہ تو خیر پہنچیں ہی لیکن پھر جو بڑا اندیشہ اس کے دل کو لگا ہوا تھا وہ کچھ اور ہی تھا۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان میں پہنچ کر آپ کو ایک نئی دھن سمائی وہ یہ تھی کہ جہاں کہیں راستہ میں کوئی بُت نظر آیا آپ فوراً اس پر دست شفقت پھیر دیتے تھے۔ اور جہاں دیکھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں اور موقع نہیں ہے وہاں تاک میں رہتے اور آنکھ بچا کر اپنا کام کر کے چلتے پھرتے نظر آتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ساری راہ میں یہ ڈر لگا رہا کہ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو جان پر آبنے گی۔ مگر باوجود اس کے وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آتے تھے۔ اور محض بغرض حصول ثواب یہ کام ضرور کر گزرتے تھے حالانکہ آپ ڈاکٹر آف سول لا تھے۔ اور جب گوا پہنچے ہیں تو گوا گورنمنٹ نے ان کو بہت غنیمت جانا اور ایک بیش مقدار تنخواہ دیکر چاہا کہ انہیں اپنے ہاں رکھ لے مگر انہوں نے منظور نہ کیا۔ اگر خدانخواستہ وہ گوا میں رہ جاتے تو شاید دکن کا کوئی بت ان کے ہاتھ سے صحیح سالم نہ بچتا۔

اورنگ زیب کے معترضین نے جہاں اس پر اور بہت سے الزام قائم کئے ہیں وہاں ایک بت شکنی کا الزام بھی ہے۔ اگرچہ کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ اورنگ زیب کے کیریکٹر اور مصالح کے سمجھنے میں لوگوں نے بہت کچھ غلطی کی ہے۔ اور خصوصاً یورپین مؤرخوں نے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ وہ رنگ سب پر غالب آگیا ہے اور ان کی بہت سی ادائیں مسلّمات میں سے سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر نظر تحقیق سے دیکھا جائے تو ان کی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوتی ہے۔ وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ تاریخ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کی جائے گی اور جھوٹی رنگ آمیزیاں سب زائل ہو جائیں گی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ خاص اورنگ زیب کے زمانے میں ایک یورپین اور وہ بھی رومن کیتھلک اور پھر ڈاکٹر مول لا دور دراز کے ملک سے سفر کر کے ہندوستان آئے گا۔ اور بلاوجہ اور کسی اشتعال کے بت شکنی کرے گا۔ اب ہم اس کی زبانی اورنگ زیب کی بے تعصبی کا حال سنواتے ہیں حالانکہ یہ شخص

مسلمانوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

غرض وہ ۱۷ مارچ کو منزل مقصود پر پہنچا اور ان عیسائیوں نے جو اورنگ زیب کی فوج میں ملازم تھے اس کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ اور انہوں نے اس سے بیان کیا کہ اس بادشاہ کی ملازمت میں حقیقی مسرت اور لطف حاصل ہوتا ہے۔ اور کوئی بادشاہ اپنے سپاہی کو اتنی تنخواہ نہیں دیتا جتنی یہ دیتا ہے۔ اگر وہ کسی روز نہ لڑیں یا اپنا فرض ادا نہ کریں تو جرمانہ میں صرف اسی روز کی تنخواہ وضع ہو جاتی ہے اور بس۔ اور ان کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوتی۔ فوج میں رومن کیتھلک عیسائیوں کا ایک گرجا بھی تھا۔ جس میں دو کینزی پادری مذہبی رسوم ادا کرنے پر ملازم تھے۔ گیملی نے ایک یہ بھی واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ دو مسلمان شراب پینے کے جرم میں ماخوذ ہوئے اور عیسائی کپتان کے حکم سے انہیں دُرّے لگائے گئے۔ اور ان مسلمان ملزموں نے اس بجا اور معقول سزا کا شکریہ ادا کیا۔

مُصوّری

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ مصوّری مغل دربار میں ابتدا سے ہی بہت فروغ پر رہی۔ بابر خود اپنی توزک میں بہزاد اور شاہ مظفر جیسے مصوّروں کے کارناموں پر تنقید کرتا ہے۔ ہمایوں کا عہد آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے کتب خانہ میں مصوّر کتب بہزاد کی بنائی ہوئی تصاویر اور سلطان علی مشہدی کی لکھی ہوئی موجود تھیں۔ جس کی شہادت ہمیں یوں بھی ملتی ہے کہ جب وہ احمد آباد میں مقیم تھا تو اس کے خیمہ سے مصوّر نامہ کا نسخہ چور لے گئے۔ اور یہی بادشاہ ایران سے میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کو خود اپنے ہمراہ لایا اور ان کو داستان امیر حمزہ کے مصوّر کرنے پر تعین کیا۔ اکبر کا عہد بہترین عہد مغل مصوّری میں شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے مصوّرین کی حوصلہ افزائی کی اور ہزارہا تصاویر تیار کروائیں۔ جب جہانگیر کا زمانہ آیا تو اس نے مصوّروں کو انعام و خطاب دئے اور ان کو مصوّری کے معنوی پہلو کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اور شاہجہاں کا زمانہ اگرچہ فن تعمیر میں بہترین زمانہ شمار ہوتا ہے۔ مگر مصوّری میں یہ عہد زیادہ تر شبیہات کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم ایک شاہجہاں کے عہد کا مرقع لندن میں چیسٹر بیٹی کے مجموعہ میں دیکھتے ہیں۔ جو طبع بھی ہو چکا ہے بلکہ شہزادگاں اور شہزادیوں میں بھی مصوّری کا ذوق تھا۔ کیونکہ داراشکوہ نے ایک مجموعہ مرقع داراشکوہ کے نام سے تیار کیا جو آج بھی انڈیا آفس لنڈن میں موجود ہے۔ اور خود داراشکوہ نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا[1]۔ اسی طرح ایک مرقع زیب النسا کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

جن سیاسی حالات میں اورنگ زیب کے عہد کا آغاز ہوا وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اور مجموعی حیثیت

---

[1] بارٹن ص۸۰۔ واورنٹل کالج میگزین ۱۹۳۷ء

سے ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کو ان فنون کی طرف سیاسی ماحول کی وجہ سے توجہ کا کم موقع ملتا تھا۔ اگرچہ وہ ان کا پورا ادراک رکھتا تھا۔ ہاں البتہ اگر اس عہد میں تاریخ سپاہ گری لکھنے کا خیال ہو تو شاید یہ عہد سب پر سبقت لے جائے بلکہ یوں کہئے کہ اس نے نظام حکومت میں کسی قسم کا تغیر نہیں آنے دیا۔ کیونکہ مآثر عالمگیری میں نقاش خانہ کے قیام کا ذکر بالوضاحت یوں ملتا ہے :-

"میر عبدالکریم بالضام خدمت جانماز خانہ بداروغگی نقاش خانہ نقش نکو خدمت درست کرد و راقم بمشرفی آں کارخانہ رنگ عزت براد آورد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"[1]

ایک میر عبدالکریم ہمیں شاہجہاں کے عہد میں بھی نظر آتا ہے جس کے اہتمام سے قلعہ لاہور کا شاہ برج ۱۰۴۱ھ میں تعمیر ہوا۔ جس کا نام لاہور کے قلعہ کے دروازہ پر کتبہ میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد اسے آگرہ میں تاج محل کی تعمیر کے اہتمام کے لئے تبدیل کر دیا گیا جہاں اس نے مکرمت خاں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ سرکاری طور پر نقاش خانہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ضرور قائم رہا۔ اگرچہ انفرادی طور پر مصوّرین کی سرپرستی کا ثبوت اکبر اور جہانگیر کی طرح نہیں ملتا۔ یہ بھی درست ہے کہ سرکاری طور پر کسی مستقل کتاب یا مسودہ کا مصوّر و مطلا کرنا اس عہد میں نظر نہیں آتا۔ مگر راقم کو ۱۹۳۰ء میں پٹنہ میں وہاں کے مشہور بیرسٹر مسٹر مانک کے مجموعہ نوادرات میں ایک مصوّر نسخہ عالم گیر نامہ یعنی ابتدائی دہ سالہ تاریخ عہد عالم گیر مصنفہ محمد کاظم بن منشی محمد امین کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جو واقعی اورنگ زیب کے عہد کا تیار کردہ نسخہ تھا۔ یہ نسخہ دراصل پانچویں سال جلوس سے لیکر دسویں سال تک ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو فن کار ابتدا سے اپنی اپنی روایات پر کام کرتے آرہے تھے وہ برابر اپنے طور پر بغیر کسی سرپرستی کے اسی طرح مصروف رہے۔ اسی طرح کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں ایک مصوّر نسخہ بادشاہ نامہ مصنفہ محمد امین بن

[1] ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۳۶ء [2] مآثر عالمگیری کلکتہ ص ۲۵۵

اشیاء اور ایک ہیرا جو ساٹھ ہزار روپیہ کی مالیت کا تھا وہ سب اسی تصویر میں اہل کاران دربار طشتوں میں لئے مصوّر شدہ نظر آتے ہیں۔ مصوّر اس تصویر کے بنانے میں بہت کامیاب ہے اور دہلی کا دیوان عام بالکل واضح ہے۔ غرضیکہ یہ تصویر اس عہد اورنگ زیب کا ایک شاہکار ہے۔

دہلی میں ۱۹۱۱ء میں بادشاہ جارج پنجم انگلستان کی تاجپوشی کے موقع پر ایک نمائش کی گئی جس کی ایک فہرست بھی بہت عمدگی سے مرتب ہوکر طبع ہو چکی ہے۔ جس کو مانگی ہوئی اشیاء کی نمائش کہتے ہیں اس میں ایک تصویر اورنگ زیب کے دربار کی پیش کی گئی جس میں بادشاہ اوپر دیوان خاص کے بجارچہ میں بیٹھا ہے اس کے دائیں طرف شہزادہ بہادر شاہ، بائیں طرف شہزادہ معظم ہے۔ درمیان میں تخت رکھا ہے جس پر نواب اسد خاں کھڑا ہے۔ جو وزیر اعظم تھا بادشاہ کے حضور میں کاغذات پیش کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ اسی مراتب میں دیگر امراء بھی کھڑے ہیں جن میں روح اللہ خاں، خلیل اللہ خاں۔ سپہدار خاں، اس کے دائیں طرف محض ایک اور نام دیا ہے جو واضح نہیں ہے۔ نواب امیر خاں و فتح اللہ خاں تصویر کے نیچے قطار میں مہابت خاں، رشید خاں، زبردست خاں، منعم خاں، دائیں طرف ہیں۔ اخیر آدمی کا نام درج نہیں ہے۔ بائیں طرف ابراہیم خاں، ذوالفقار خاں۔ جعفر خاں، کچھ آدمیوں کے نام درج نہیں ہیں۔ تاریخ کے اعتبار سے یہ تصویر ۱۰۸۲ھ کے بعد کی ہونی چاہیئے۔ کیونکہ نواب اسد خاں غالباً ۱۰۸۲ھ میں یا اس کے بعد وزیر اعظم ہوا۔

اسی متذکرہ بالا تصویر کو آکسفورڈ سے لیکر مسٹر پرسی براؤن نے بھی اپنی کتاب "ہندی مصوری مغلوں کے عہد میں پلیٹ نمبر ۳۰ پر چھاپ کر یہ عنوان دیا ہے۔ "ایرانی سفیر شاہجہاں کے دربار میں" جس سے تعارض پیدا ہوتا ہے اور تحقیقی کام کرنے والے کے لئے مزید مشکلات کا سامنا ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اورنگ زیب اور شاہجہاں اپنے چہروں پر داڑھی کی وجہ سے کسی قدر ایک ہی معلوم

۱ Loan Exhibition Delhi, ۳۵۶/c

ہوتے ہیں۔ اورنگ زیب ۱۰۶۱ھ میں جب کہ اس کے دربار میں ایرانی سفیر آیا اس کی عمر ۴۳ سال تھی۔ اور دہلی کا دیوان عام ۱۰۴۸ھ سے پہلے ہی معرض وجود میں تھا اور اس کے ساتھ ہی آکسفورڈ میں اسی مرقع (Ouseley Add. 173) دربار شاہجہاں کی تصویر ہے جو دہلی کے قلعہ کے دیوان عام کی ہے اور یہ بالکل واضح ہے اور متذکرہ بالا تصویر بھی دہلی کے قلعہ کے دیوان عام کی ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ شاہجہان والی تصویر میں دیوان عام کے آگے ہاتھی دو برابر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ مگر اس اورنگ زیب والی میں نہیں ہیں۔ ہمیں خوب علم ہے کہ اورنگ زیب نے ان کو اٹھوا دیا تھا۔ اس لئے ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ بنین نے ٹھیک اسے اورنگ زیب کی تصویر کی ہے بلکہ بنین نے اس کو اورنگ زیب کی تصویر ماننے سے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ جھروکہ کے ایک طرف بادشاہ کے ادھر جو لوگ کھڑے ہیں۔ اغلب ہے اس کا فرزند ثانی سلطان معظم فرزند سوم اور ملا علاء الملک تونی ہیں۔ اس کا فرزند اوّل اس وقت گوالیار میں اسیر تھا جو اس تصویر میں موجود نہیں ہے۔ اب مزید ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہاتھی کب ہٹا دئے گئے تھے۔ مآثر عالمگیری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۱ سن جلوس میں اٹھائے گئے تھے۔ یعنی ۱۰۷۸ھ جو واقعی ضرور قابل توجہ ہے جس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ تصویر بھی شاہجہاں کی ہوتی اور اسی طرح دیوان عام کی تصویر ہوتی تو اس میں ہاتھی ضرور دکھائے جاتے۔ جب وہ نہیں ہیں اور تصویر واقعی دیوان عام کو پیش کرتی ہے تو ہر حالت میں اورنگ زیب کی ہے۔ ویسے اورنگ زیب کی ایک یک رخی تصویر بطور خاکہ کے لنڈن میں برٹش میوزیم میں (BM. Add. 1880) ہے اور دونوں میں مماثلت ہے۔

ایک تصویر میں اورنگ زیب گھوڑے پر زرہ بکتر پہنے بیٹھا مصوّر کیا گیا ہے۔ گھوڑے پر نہایت عمدہ شاہانہ جھول ہے۔ اس کے اپنے ہاتھ میں بھالا ہے۔ اس کے پیچھے دیگر خدمتگار کھڑے

۱ پری راؤن۔ انڈین پینٹنگ انڈر دی مغلز۔ آکسفورڈ ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۰۰ پلیٹ ۳۰

ہیں۔ جن میں ایک شخص صاف نظر آتا ہے کہ اس نے نقدی کی تھیلی کو سنبھالا ہے جو غالباً برائے نثار و خیرات ہے اور بالکل تمام شاہی جاہ و جلال سے معاہر اور شاہی وقار و ایک معمول مغل دربار واضح کرتی ہے۔ یہ اس نمائش متذکرہ بالا دہلی میں بنارس کے راجہ کے محل سے آئی تھی[1]۔

ایک تصویر میں جو محض ایک خاکہ جھلی پر ہے اورنگ زیب کو یک رخ کر کے اس طرح مصوّر کیا گیا ہے کہ اس کے سامنے دو راجپوت امراء ہیں جو بادشاہ کو خنجر پیش کر رہے ہیں۔ یعنی ایک طرح اطاعت کی دلیل ہے۔ اورنگ زیب کے بائیں ہاتھ میں کوئی کتاب معلوم ہوتی ہے اور دائیں ہاتھ میں ظفر تکیہ ہے ایک بڑی تلوار بھی پاس رکھی ہے[2] (۱۶۴۰)

اسی نمائش میں ایک بہت عمدہ تصویر اورنگ زیب کی ابتدائی زمانہ سلطنت کی آئی تھی جس میں اورنگ زیب نہایت رعب میں استادہ دکھایا ہے اور اس تصویر کے دوسری طرف ایک خط مشہور خطاط آقا عبدالرشید دیلمی کا ہے جو اس نے بادشاہ شاہجہان کو بطور درخواست برائے وظیفہ پیش کیا تھا[3] (۱۶/۳۰۳)

اس سے آگے ایک تصویر شاہی جلوس کی ہے جو ہاتھیوں اور گھوڑوں پر مشتمل ہے جھنڈے تک ان پر لگائے گئے ہیں۔ اس تصویر میں نیچے کر کے اورنگ زیب درمیان میں تخت پر جلوہ گر ہے۔ تمام امراء وغیرہ حفظ مراتب کے اعتبار سے استادہ ہیں۔ باہر کے حلقہ میں نقارچی بھی ہیں جو نوبت وغیرہ بجا رہے ہیں۔ غرضیکہ یہ ہر دو تصاویر ایک وہ جو اس سے پہلے بیان کی گئی ہے اورنگ زیب کے ضمن میں بہت اہم ہیں اور مصور نے ان واقعات کی تصاویر کو صرف اپنے مشاہدہ سے بنایا ہے۔ اور امراء کو خوب عمدگی سے جانتا ہے بلکہ ان درباریوں کے فرائض تک سے بھی واقف ہے جو ان تصاویر سے بخوبی عیاں ہے[4] (۳۵۵/۴)

[1] ایضاً ۱۶۲/۴ ، [2] ۱۶۲/۴ ، [3] ۱۶۱/۴ و ۲۰۳/۴ ، [4] ۳۵۵/۴

ان متذکرہ بالا تصاویر کے علاوہ عام طور پر ذیل کی تصاویر اورنگ زیب کی ملتی ہیں۔

A۔ اورنگ زیب قرآن کریم کے لکھنے میں مصروف ہے

B۔ اورنگ زیب اپنے بچوں کے ہمراہ قصر شاہی میں ایک طرف شامیانہ میں سرود سن رہا ہے اور یہ تصویر عرصہ ہوا جرنل آف آرٹ میں شائع ہو چکی ہے جس سے اس کی خانگی زندگی پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

C۔ اورنگ زیب کو ہوادار میں پالکی بردار لئے جا رہے ہیں۔ یہ تصویر سب سے پہلے مولانا ستار خیری نے اپنی جرمن کتاب مغل مصوری میں یورپ کے کسی مجموعہ سے لیکر شائع کی تھی۔

یورپین محققین کی رائے

مغل مصوّری ابتدا ہی سے ARISTOCRATIC امیرانہ یا درباری رسم ورواج کی پابند رہی ہے جس کی بنا پر مصوّرین شاہان، نوابان، امراء و رؤسا کی شبیہہ تیار کیا کرتے تھے۔ جس کے متعلق فرانسیسی سیاح موسیو برنیئر بھی اپنے سفرنامہ میں عہد اورنگ زیب کی مصوّری کے متعلق لکھتا ہے اور وہ یہاں کی بہترین شبیہہ کشی سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی فنی اعتبار سے تنقید بھی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

اس کے ان متذکرہ بالا الفاظ سے ہماری یہ بھی تصدیق ہوتی ہے کہ اس دور کی مصوّری میں تنزّل

لہ ملاحظہ ہو سفرنامہ اردو ترجمہ ص ۲۷۲

شاہجہان کے عہد سے ہی شروع ہو گیا تھا جس کی وہ شکایت کرتا ہے کیونکہ برینیر ہر دو کے عہد میں ہند میں تھا۔ اور دوسری طرف عہد جہانگیری کے متعلق سر ٹامس رو کی شہادت ہے کہ بہترین کام ہوتا تھا۔ اس سے اتنا ضرور ثبوت ملتا ہے کہ مصوری کام کرتے تھے اور شعبہ مصوری شعبہ ہائے دربار سے تھا جیسا کہ مآثر عالمگیری کے متذکرہ بالا الفاظ سے واضح ہے۔

مسٹر لارنس بنین برنیر کے الفاظ ذیل درج کرنے سے پہلے لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے مصوری کو بند نہیں کیا تھا۔ شبیہہ کش مصور ابھی تک اپنے کام میں مصروف تھے۔ مگر وہ فنون میں اور ماہرین فن سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔

"دہلی میں ہنرمند کاریگروں کے کارخانے بالکل نہیں ہیں مگر اس کا سبب یہ نہیں کہ ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں بہت سے ہوشیار اور ذہین لوگ پائے جاتے ہیں اور بے شمار خوبصورت چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں جن کو لوگ بغیر کلوں کے بناتے ہیں اور جنہوں نے شاید کسی استاد سے بھی تعلیم نہیں پائی ہوئی اور بعض اوقات تو یہ لوگ یورپ کی چیزوں کی ایسی کامل طور سے نقل کرتے ہیں کہ اصل و نقل میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ منجملہ اس قسم کی اور اشیاء کے نہایت عمدہ شکاری اور جنگی بندوقیں ہیں۔ اور سونے کے زیور تو ایسے عمدہ بناتے ہیں کہ کوئی یورپین سنار ان سے بڑھ کر شاید ہی بنا سکے۔

مصوری اور نقاشی کا بھی ایسا نازک اور باریک کام تیار کرتے ہیں کہ جسے دیکھ کر ہی اکثر حیرت میں آگیا ہوں۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی بڑی بڑی بھوں کی ایک شبیہہ جو ایک مشہور اور نامی مصور نے ایک ڈھال پر سات برس کے عرصہ میں تیار کی تھی۔ اس نے بالخصوص مجھ کو حیران کر دیا۔ اور میں نے اس کو ایک عجیب خیال کیا۔ مگر ہندوستانی مصور اکثر تصویر میں تناسب اعضا اور ان حالتوں

کے ظاہر کرنے میں جو مختلف اوقات میں انسان کے چہرہ پر نمایاں ہوا کرتی ہیں پکے ہیں۔ لیکن اگر ان کو ایک اچھا استاد اس فن کے اصول کی تعلیم دے تو یہ عیوب جلد رفع ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے اس دارالسلطنت شہر میں دستکاری اور ہنرمندی کے اعلیٰ قسم کے نمونوں کا پایا جانا لوگوں کی کند ذہنی اور ناقابلیت کی وجہ سے نہیں ہے اور کاریگروں اور کارخانہ داروں کو کچھ ہمت دلائی جائے تو بیشک مفید اور عمدہ صنعتوں اور حرفتوں کو ترقی ہو سکتی ہے۔ اور دولت مند لوگ ہر ایک چیز ارزاں قیمت پر لینی چاہتے ہیں۔ اور جب کبھی کسی امیر یا منصب دار کو کسی کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے تو بازار سے بلوا لیتا ہے۔

پرسی براؤن کی اس عہد کی مصوری کے متعلق یہ بھی رائے ہے کہ اس کم توجہ اور مخالفت کے باوجود بھی تصاویر متاثر حصہ سترھویں صدی عیسوی میں بہت زیادہ تعداد میں ملتی ہیں اور مصوری کا فن عام نظر آتا ہے جیسا کہ اورنگ زیب کے بزرگوں میں تھا جو اس سے کم مذہبی طور پر مخالف تھے ان تصاویر میں اکثر ایسی معلوم ہوتی ہیں جو اورنگ زیب کی رضامندی سے بنائی گئیں کیونکہ ان میں وہ بذات خود بھی موجود ہے جس میں وہ اکثر شکار کرتا ہوا، سفر کرتا ہوا، مطالعہ کرتا ہوا، سلطنت کے امور کا جائزہ لیتا ہوا، فوج کو سنبھالے ہوئے مصور کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم جہانگیر اور شاہجہاں کو مصور کیا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان امور سے ضرور واضح ہے کہ ان میں عام طور پر اسے بوڑھا دکھایا گیا ہے بلکہ بعض اوقات اسے جھکا ہوا عصا سے سہارا لئے ہوئے تک مصور کیا گیا ہے۔ اس کا جواب خواہ کچھ ہو مگر اس کی زندگی کے تمام پہلو مصوری میں عیاں ہیں اور اس سے اس کا مصوری سے رغبت کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔ اور مصوروں کی حوصلہ افزائی اگر شخصی طور پر نہیں تو کم سے کم مجموعی حیثیت میں فن مصوری کی حوصلہ افزائی فن کی حد تک ضرور ہے۔

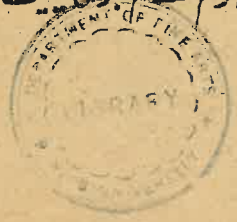

۱ براؤن ص ۱۰۱

مغل حرم کی محترمات کی تصاویر

پرسی براؤن لکھتا ہے کہ مغل مصوری دراصل مردانہ فن تھا۔ کیونکہ عام طور پر جو تصاویر ملتی ہیں ومردوں کی زندگی اور بادشاہوں کے حالات کو پیش کرتی ہیں۔ عورتوں کے حالات یا ان کی زندگی سے متعلق تصاویر و حالات پر کم توجہ دی گئی ہے۔ معاشرتی حالات ان لوگوں کے کم سے کم زیادہ نظر آتے ہیں۔ مینوخی اطالوی ڈاکٹر مؤلف سٹوریا ڈی موگر جو کئی سال اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان میں مقیم رہا نہایت شدومد سے لکھتا ہے کہ مجھے کبھی کسی شہزادی یا ملکہ کی تصویر میسر نہیں آئی کیونکہ ان کو دیکھنا تک ممکن نہیں۔ شکر کا مقام ہے کہ وہ ہر وقت پردہ میں رہتی ہیں اگر کسی نے کوئی ایسی تصویر پیدا بھی کرلی اور بنادی تو اس تصویر شدہ عورت کو داشتہ ناچنے والی یا گائن ان حالات کی سمجھنا چاہیئے۔ اور وہ بھی اس مصور کے مزاج اور نظریہ کے مطابق کی گئی ہے۔ براؤن نے مزید کہا ہے کہ واقعی جو تصاویر ہم تک اس قسم کی شہزادیوں یا ملکہ کی پہنچی ہیں وہ اطالوی ڈاکٹر مینوخی کے نظریہ یا شہادت کی تصدیق کرتی ہیں۔ کسی مصور کو تو کیا غیر مرد کو حرم تک جانے کی اجازت نہ تھی کہ اندر جاکر تصویر اتار سکے یعنی کسی طرح بھی متداول تصاویر میں سے ان کی تصویر کہی جاسکتی ہیں۔ یہاں نورجہاں اور جہانگیر کے معاملہ سے بحث نہیں یہ محض اورنگ زیب کے عہد سے متعلق ہے[1]۔

مصوّری کا سیاسی مصرف

اورنگ زیب کو فن مصوری کی اصل حقیقت استعمال کا خوب اچھی طرح علم تھا چنانچہ جس طرح محمود غزنوی نے ابن سینا کی تصویر اپنے درباری مصورین کی معرفت طلب کی تھی۔ جس طرح شاہ رخ نے اپنے سفیر کے ساتھ

[1] پرسی براؤن۔ انڈین پینٹنگ۔ انڈوی مغل آکسفورڈ ۱۹۲۴ء ص ۱۵۷

مصوّر خواجہ غیاث الدین کو مصور حالات ارسال کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جس طرح شاہ عباس نے محمد زمان کو اطالیہ میں وہاں کی مصوری کا کام دیکھنے کی غرض سے تعین کیا تھا۔ جس طرح جہانگیر نے مصور بسندواس کو اپنے سفیر خانعالم کے ہمراہ شاہ عباس کی تصویر اتار کر لانے کے لئے بھیجا تھا۔ اسی طرح اورنگ زیب نے بھی مصورین کو وقتاً فوقتاً گوالیار ارسال کیا تاکہ اس کے زیر حراست لڑکے محمد سلطان کی تصویر بنا کر اس کی صحت کی اصل حالت پیش کریں[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہی ملازمت میں مصور تھے اور اورنگ زیب کو مصوری کی حقیقت کا خوب علم تھا۔

شبیہات

اورنگ زیب کے عہد کی مصوری کا عظیم الشان کارنامہ اس کے وزیر اعلیٰ نواب اسد خاں کی شبیہہ ہے جو حسن اتفاق سے آج بھی انڈیا آفس لنڈن میں محفوظ ہے۔ نواب اسد خاں کا اصل نام محمد ابراہیم تھا۔ یہ شخص نواب صادق خاں کا پوتا اور آصف خاں کا داماد تھا۔ شاہ جہاں نے اسے خان سامان مقرر کر کے اسد خاں کا لقب دیا تھا۔ شاہ جہاں نے خود اورنگ زیب کے بادشاہ ہونے پر اس سے کہا تھا کہ اس قابل اعتبار شخص کو ملازمت میں لے۔ چونکہ وہ خود مردم شناس تھا۔ اس نے فوراً باپ کی یہ بات مان لی اور دربار میں جگہ دے دی۔ وہ ترقی کرتا ہوا اورنگ زیب کے آخر سینتیس سال عہد میں یہی شخص اس کا وزیر اعلیٰ رہا۔ ۱۱۱۳ھ میں اسے امیر الامرا کا خطاب ملا۔ اورنگ زیب کے بعد اس کے لڑکے بہادر شاہ کا بھی اسی طرح جاں نثار اور معتبر رہا۔ اور جہاندار شاہ کے عہد میں یہ اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوا۔ اس کا انتقال ۱۱۲۴ھ میں ہوا۔ یہ تصویر نواب اسد خاں کی جس پر ان کا نام بھی نیچے بائیں کونہ میں ثبت ہے۔ واضح کرتی ہے کہ وہ ایک عصا پر سہارا لئے کھڑا ہے

[1] اخبارات دربار معلی ص ۹ جادو ص ۴۲

ساتھ ہی خنجر و قبضہ برابر لگا ہے۔ تلوار لٹک رہی ہے۔ بلکہ پٹکا کمر سے لپٹا ہوا عیاں ہے۔ تصویر بذات خود یک رخی ہے۔ نواب کسی طرف برابر نگاہ کئے ہے۔ غرضیکہ یہ تصویر اس وقت کا بہترین نمونہ فن کے علاوہ اس زمانہ کی بود و باش امیرانہ سے بھی مزین ہے۔ میرے خیال میں یہ تصویر اس وقت بنائی گئی جب نواب کو ۱۱۱۳ھ میں امیر الامراء کا خطاب ملا تھا۔

نامدار خاں جو کبھی شہزادہ کا بہت بڑا معتمد علیہ تھا مگر جب اورنگ زیب بادشاہ ہوا تو اس نے اطاعت کر لی تھی اسے اورنگ زیب نے آگرہ کا والی مقرر کیا تھا۔ ایک تصویر میں اسے گھوڑے پر سوار دکھایا ہے۔ تصویر کے اعتبار سے بہترین شبیہات عہد اورنگ زیب ہی شمار ہونی چاہیئے۔ (۔ 142)۔

اسی طرح ایک تصویر اورنگ زیب کی اپنی آکسفورڈ میں بارلین لائبریری میں (173. Ouseley) ہے۔ جسے مصور انوپ چرتر نے بنایا ہے۔ اور اس کے متعلق اوپر بیان گذر چکا ہے۔ یہ تصویر اورنگ زیب کی غالباً اس کے ابتدائی سالوں کی ہے اس تصویر میں اس کے تمام ابتدائی خدوخال موجود ہیں۔

اس کے علاوہ اس کے ساتھ ہی اسی جلد میں ایک اور تصویر شہزادہ کام بخش بن اورنگ زیب کی ہے اور یہ حسین شہزادہ جو اورنگ زیب کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور اس کا بہت چہیتا تھا۔ یہ شہزادہ اورنگزیب کے ہمراہ دکن میں تھا۔ اور گولکنڈہ و بیجاپور کا گورنر یکے بعد دیگرے بنایا گیا تھا۔ جب باپ کی وفات کے بعد بہادر شاہ تخت پر بیٹھا تو کام بخش نے اس کی اطاعت نہیں کی بلکہ اس کے خلاف جنگ کی اور گولکنڈہ کے قریب پسپا ہو گیا۔

غرضیکہ یہ چند مشہور و معروف شبیہات کے متعلق مختصر لکھا گیا ہے جو کسی قدر کافی سمجھتا ہوں اس کے لئے دیگر مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔

دیواروں پر تصاویر مٹانے کا الزام

اورنگ زیب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے بیجاپور کے اثار محل کے اندر کی دیواری تصاویر کو

اکبر بادشاہ کے مقبرہ کی دیواری تصاویر کو مسخ کر دیا تھا۔ اوّل الذکر کو فرگسن اور میڈوز ٹیلر نے بیان کیا اور موخر الذکر کو نکولا مینوخی نے بیان کیا ہے۔ کہ اس پر سفیدی کرائی گئی تھی[1] چونکہ میں نے ان مقامات کو خود دیکھا ہے اس لئے ذرا یہ ہر دو معاملات وضاحت چاہتے ہیں۔ اوّل الذکر میں تو صاف تصاویر نظر آتی ہیں۔ کہ ان کے چہروں وغیرہ کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ اور یہ تصاویر کسی حد تک الفیہ وشلفہ کی ہیں۔ جو اس امر کی دلیل ہے کہ یہ محل عادلشاہی بادشاہوں کے رہنے اور عیش و طرب کے لئے تھا۔ جس کا اس وقت اثار محل نام ہرگز نہیں تھا۔ جو بعد میں ہوا اور اس میں اثار مبارک صلعم رکھے گئے جو ابھی تک وہاں ہیں۔ ان کی وجہ سے سال بھر میں یہاں ایک دفعہ میلاد النبی بھی ہوتا ہے اور سرکار کی طرف سے ان تمام اخراجات کے لئے رقم کثیر مقرر ہے۔ صاحب بصیرت و فہم کے لئے یہ معاملہ ذرا سوچ طلب ہے کہ اس محل میں جہاں اثار مبارک صلعم ہوں وہاں ایسی تصاویر کا کیا کام۔ خواہ کسی نے بھی یہ عمل کیا میرے خیال میں ان اثار صلعم کو مدنظر رکھ کر بہت اچھا کیا۔ یہ بالکل دو متضاد امر ہیں۔ اور یہی حالت مقبرہ اکبر سکندرہ میں ہے۔ جہاں آدمی دفن ہو وہاں آیات قرآنی یا وہاں ایصال ثواب کیا جائے یا آیات کو دیکھا جائے۔ اس وقت تو وہاں کوئی تصویر نظر نہیں آتی۔ اگر تھی تو سراسر غلطی تھی۔ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ معترضین کسی چیز پر اعتراض کرنے سے پیشتر اس کی اصل حقیقت کو نہیں دیکھتے کہ کس بنا پر یا کس نیت پر یا کس مذہبی اصول پر کوئی چیز واقع ہے۔ جو شخص اس قدر وسیع سلطنت کو سنبھالتا ہے ہرگز ایسی بے اعتدالیوں کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

بیجاپور کا اثار محل فنی اعتبار سے بھی قابل دید عمارت ہے اس میں ان متبرک آثار کو عالمگیری عہد کے کپڑوں میں لپیٹ کر نہایت احترام سے رکھا ہوا ہے۔ ان کپڑوں پر قرآن کریم کی آیات بُنتی میں نکالی ہوئی ہیں۔ اور قالین و فرش ہیں جو میلاد النبی کے روز استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہاں ایک سنگ موسیٰ کی سل

[1] پرسی براؤن۔ انڈین پینٹنگ انڈر دی مغلز۔ آکسفورڈ ۱۹۲۴ء صـ۱

پر ذیل کا کتبہ کندہ ہے جس سے اس آثار محل کی اصل حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان سب سے عہد عالمگیری کے فن پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ کتبہ ذیل میں ہے :۔

دراں کشور کہ آثار تو باشد
جہاں را چشم دیدار تو باشد
برائے عاصیاں فضل تو رافت
اگر موئے ز لطف تست کانست
مبارک منزلے خوشتر نرسیاں
بود خاکش شفائے دردمنداں
بود ایں کعبہ ثانی جہاں را
خدا آنساں نمود عاصیاں را
زہی جائے کہ عرش ہمسر نیست
ستونش بر یکی چوں رکن زیست

سنہ ۱۱۱۱ھ

برآور آخریں دست دعا را
کہ روز حشر بستانی جزا را
بود آثار ہستی تا جہاں را ــــ خدا باشد دار و ایں مکاں را

امید ہے اب ان متذکرہ بالا حالات سے مزید واضح ہو جائیگا کہ اس محل میں تصاویر کسی قسم کی کسی حالت میں نہیں رہ سکتیں۔ ورنہ کسی مسلمان والی کے ایمان میں کمی کا شائبہ ہو سکتا ہے۔

حرم محترم شاہان مغلیہ کی تصاویر جو آج کل دیکھنے میں آتی ہیں ان کے متعلق میونخی جوا در نگ زیب

کے عہد میں تھا لکھتا ہے کہ:۔

"میں کسی ملکہ یا شہزادی کی شبیہہ کو پیش نہیں کرتا کیونکہ ان کو دیکھنا ناممکن ہے۔ شکر ہے کہ وہ ہر وقت پردہ نشین ہوتی ہیں۔ اگر کسی نے ایسی تصویر کو ہم تک بھی پہنچایا ہے ان کو منظور نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ محض ناچنے والی یا کنچنیاں کی تصاویر ہیں جو محض تصور کے مطابق کھینچی گئی ہیں۔"

واقعی جو تصاویر اس وقت نظر بھی آتی ہیں وہ بینی کے نقطہ نگاہ کے مطابق ہیں۔ اور اس کے ان الفاظ سے اس وقت کے خاص کر اورنگ زیب کے حرم کے پردہ کے متعلق کافی دلیل ہے۔

ہندو مصوّری

اورنگ زیب کے عہد میں مصوّری کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے جسے عام طور پر ہندو لکھنے والوں نے راجپوت مصوّری سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک راجپوت امراء نے مصوّروں کی سرپرستی کی۔ ممکن ہے یہ نام یا تعبیر ٹھیک ہو مگر ہمارے نزدیک بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس مصوّری کو ہندو مصوری کہا جائے کیونکہ اس میں عام طور پر جو تصاویر تیار کی گئی ہیں وہ ہندو مذہب سے زیادہ متعلق ہیں۔ مثلاً رادھا اور کرشن کے عاشقانہ مناظر زیادہ ملتے ہیں اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں وہی مغل فنیت اور وہی مغل امرا کا لباس اور وہی مغل عمارات کا پس منظر ان میں عام نظر آتے ہیں۔ اس لئے مصوّر شدہ مضامین کے موضوع کے اعتبار سے راقم کے نزدیک ان کو ہندو کہنا زیادہ موزون ہوگا۔ جو مجموعی حیثیت سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر ان کے مصور بھی وہی تھے جنہوں نے مغل درباروں میں تعلیم پائی تھی۔ ان مصورین کے اسماء بہت کم ملتے ہیں۔ اگرچہ اکثر مسلمان تھے اور وہ اپنے ڈھب پر ہندو مذہب کے اوتاروں کی تصاویر بناتے تھے۔ جو ایک حقیقت ہے۔ کیونکہ آج تک کسی ایسی قدیم ہندو تصویر یا نمونہ کا انکشاف نہیں ہوا جو ان مصوروں

کی بنائی ہوئی تصویر کا نمونہ شمار ہو کہ اس سے ان کو نقل کر کے بنایا گیا ہے وہ خود ہی وضع کرتے تھے۔ بلکہ یہ بھی نہایت گہرے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ اکثر قدیم ایرانی یا مغل دربار کی بنائی ہوئی تصاویر جن میں ایرانی یا مغل درباری ماحول تھا ان کو ان متاخر زمانہ کی تصاویر کے لئے پوری طرح استعمال کیا گیا ہے۔ فرق محض اسی قدر ہے کہ ان میں کرشن اور رادھا اور دیگر ہندوانی شبیہات کو مغل یا ایرانی مصوّر شدہ اشخاص کی جگہ مصور کر دیا ہے جس کو آج بہت بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا ہے بلکہ بعض لکھنے والوں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ یہ ہندو تصاویر اجنٹا اور الورا کے نمونوں پر ہیں۔ یا ان سے ان کا براہ راست تعلق ہے جو بالکل بے بنیاد دعویٰ ہے۔ جب شاہ جہاں کے لڑکوں میں تخت نشینی کے لئے جنگ ہو رہی تھی اس وقت ناصر دارا شکوہ کا خاندان جاگتا نظر آتا ہے۔ اور اس خاندان کی ملازمت میں چند مصور بھی تھے۔ جب دارا شکوہ کے لڑکے سلمان شکوہ نے گڑھوال کے راجہ فتح سنگھ کے پاس پناہ لی تو وہ ہندو مصور شیام داس اور ہرداس بھی اس وقت علاوہ دیگر ملازمین خاندان کے یہ بھی ہمراہ تھے۔ اور یہ لوگ اس ہندو دبستان مصوری کے بڑے مصوّر مولا رام کے مورث اعلیٰ تھے۔ جس نے پہاڑی راجوں کی سرپرستی میں فروغ پایا اور اس نے یہاں گڑھوال میں بے شمار شاہ کار پیدا کئے تھے۔ اور اس کا سلسلہ تلمذ آج تک قائم ہے۔ بڑے معتبر آخذ سے بیان کیا جاتا ہے کہ مولا رام بذاتِ خود ہندی اور فارسی کا شاعر بھی تھا۔ اس نے اورنگ زیب کی جنگوں کو بیان بھی کیا تھا اور تصوف کا رنگ اس وجہ سے زیادہ تھا کہ وہ ابتدا سے ہی کسی مسلمان صوفی کا مرید تھا (روپم کلکتہ ۲۵ و ۲۶ و ۳۷ و ۴۰)

اورنگ زیب کے عہد کے بعض مشہور مصوّر

اس عہد کا مشہور و معروف مصوّر انوپ چتر ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شبیہہ بنانے میں

یدطولیٰ رکھتا تھا۔ انڈیا آفس کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ داراشکوہ کی ملازمت میں تھا۔ کیونکہ وہ اپنے دستخط "عمل رای انوپ چتر داراشکوہی" (جانسن کتاب ۱۳ صہ ۹) کرتا ہے۔ جس میں ایک عورت کھڑی ہے۔ اور اس پر لکھا ہے "شبیہہ گل صفا معشوقہ داراشکوہ" اسی طرح اسی مجموعہ جانسن ۱۲۱ میں ایک تصویر (۶) پر لکھا ہے "عمل رای انوپ چتر" اسی کتاب میں اور تصاویر از مسکین محمد۔ مول چند۔ راؤ گوبند سنگھ۔ عمل رای اوتم چند۔ ایک تصویر پر کسی "روپ بائی" کا نام لکھا ہے۔ مگر انوپ چتر کے متعلق مزید مرزا عبدالقادر بیدل کے ذکر میں ملتا ہے۔ کہ ۱۱۰۸ھ میں جو اورنگ زیب کا عہد ہے۔ جب بیدل دہلی میں مقیم تھے تو ان کے ایک باکمال نقاش مسمی انوپ چتر کے ساتھ دوستانہ تعلق ہو گئے۔ اس نے آپ کی تصویر بنانی چاہی۔ چونکہ آپ تصویر اتروانے کے خلاف تھے اس لئے مصور کو اپنی مطلب برآری کے لئے بے حد منت سماجت کرنی پڑی۔ آخر کار مرزا مان گئے اور آپ کی تصویر اتاری گئی۔ تصویر ہر لحاظ سے نہایت عمدہ اور خوش وضع اتری جس کی ستائش مرزا نے بھی پُرزور الفاظ میں کی۔ دو سال بعد یعنی ۱۱۱۰ھ میں بیدل سخت بیمار ہوئے اور متواتر سات ماہ تک بیمار پڑے رہے۔ زندگی کی امید نہ رہی۔ اسی بیماری کے عالم میں آپ کے رفقا میں سے کسی نے وہی کتاب اُٹھائی جس میں آپ کی تصویر محفوظ رکھی تھی۔ تصویر مسخ شدہ حالت میں پائی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی طفل صغر سن نے عالم بے خبری میں دست نم آلود سے تصویر کو خراب کر دیا تھا۔ دیکھنے والے افسوس کرنے لگے۔ بیدل نے بھی تصویر کو دیکھنا چاہا۔ حرف غلط کی طرح محو شدہ تصویر کو دیکھ کر خوب روئے۔ تصویر ہاتھ سے رکھ دی اور عالم تنزیہ میں مشغول ہو گئے۔ (مرزا عبدالقادر بیدل۔ مضمون یٰسین خاں نیازی۔ اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۲ء صہ ۶۱)۔

مصوری بعہد اورنگ زیب کے مختلف پہلوؤں کو مختصر طور پر بیان کرنے کے بعد ایک یہ امر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی تلاش کیا جائے کہ کیا کبھی اورنگ زیب نے اس فن کو روکنے کے

نے کوئی فرمان یا حکم بھی صادر فرمایا تھا۔ تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس نے براہ راست اس فن کی حوصلہ افزائی نہیں کی تو کم از کم اس میں رد کاوٹ بھی پیدا نہیں کی۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے زمانہ میں مسلم تہوار عید۔ شب برات و عرسوں کے موقع پر لوگ مٹی کے کھلونے ذی روح جانوروں وغیرہ کے تیار کر کے بازار میں بیچا کرتے تھے۔ جس کا رواج گجرات احمد آباد وغیرہ میں عام تھا۔ اور یہ زیادہ تر ہندوؤں کے اثر سے ہوا۔ اس نے غالباً محض احترام تہوار کو مدنظر رکھ کر ان کو بنا کر فروخت کرنا بند کر دیا تھا۔ یعنی اس کے نزدیک غیر شرعی امور کو دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں کھلونے کی نفی نہیں بلکہ ذی روح کی طرف خاص اشارہ ہے[1]

مغل دربار نے ایک نہایت اہم اور بہت مفید رسم جاری کر دی تھی کہ جب کبھی کسی بادشاہ کا انتقال ہوتا تو جانشین اپنے تاج پوشی کے موقع پر اپنے کتب خانہ کے مہتمم خاص خاص مصور اور اہم نسخے نکال کر بادشاہ سے اسی روز ان پر بھی ان کے دستخط کراتے اور ان پر "عرض دیدہ شدہ" لکھ دیا جاتا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ کتاب بادشاہ کے ملاحظہ میں گذار دی گئی ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر نے اکثر کتب کو خود کتب خانہ میں دیکھا اور ان کی داد ہی نہ دی بلکہ تحسین کروانا۔

---

[1] مراۃ احمدی (تاریخ گجرات)، ۱۷۶، جلد ۲۔

خطاطی

اس عنوان کے تحت جب ہم اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے متعلق ایک مشہور نظریہ سامنے آجاتا ہے کہ وہ خود قرآن کریم لکھتا تھا۔ بلکہ یہ بھی مشہور ہے کہ یہ مشغلہ اس کی روزی کا ذریعہ بھی تھا۔ جس سے ماقبل تمام زمانہ کا ماحول اس کے عہد سے بالکل مختلف ہوجاتا ہے۔ کیونکہ بادشاہ وقت اس میں براہ راست بحیثیت فن کار شامل ہے۔ یہ بھی درست ہے جس فن وادب کی طرف اس عہد کے رئیس یا بادشاہ کا میلان ہوگا عوام کا رجحان بھی اسی طرف ہوگا۔ اس کے علاوہ ابتدا سے ہی شہزادوں میں یہ مشغلہ فن خطاطی ہمیشہ بہت عزیز اور محبوب ترین مشغلہ رہا ہے۔ میرے خیال میں ان کے سامنے ہمیشہ ذیل کا مشہور قول مدنظر رہا ہے:۔

ادّبوا اولادکم بحسن الخط فانہ من مفاتیح الرزق (ترجمہ) اپنی اولاد کو اچھے خط سے تعلیم دو کیونکہ یہ رزق کی کلید ہے۔ یعنی اس نظریہ کے تحت ان تمام شہزادگان کا خود پڑھنا لکھنا اور اپنی اولاد کو اس سے آراستہ کرنا ایک فرض ہوگیا تھا۔ بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ شاہجہاں نے رشید دیلمی جیسوں کو تعلیم خوشنویسی کے لئے مقرر کیا تھا۔ مگر خاص کر اورنگ زیب کا عہد عجیب وغریب اس فن لطیف کے اعتبار سے نظر آتا ہے کیونکہ اس میں ہمیشہ ایک ادنیٰ فرد سے لیکر بادشاہ وقت تک آپس میں ہمسری کرتے اور مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ دوش بدوش اس فن کو فروغ دیتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ تعلیم کسی کا اجارہ نہیں اس میں سب براہ راست حصہ لے سکتے ہیں۔ خاص کر اورنگ زیب کا بوجہ خود فن کار ہونا فن خطاطی کے اعتبار سے اس طرح بھی ماقبل زمانہ سے مختلف ہے کہ اس زمانہ تک قریب قریب تمام اقسام طرزیں و انواع خط اپنے اپنے ارتقائی مراحل طے کرکے ایک خاص اہمیت اور صورت اختیار کرچکے تھے۔

یعنی اس کے عہد کے بعد ظاہرہ خط میں کوئی مزید طرز یا نوع یا قسم نظر نہیں آتی اور نہ کوئی خاص فن کار ہوا جس نے اورنگ زیب کے عہد کے بعد اس فن میں اضافہ کر کے کوئی خاص صورت یا نام پیدا کیا۔ ہاں خطاط ہر عہد میں ضرور ہوتے ہیں۔ نام پیدا کرتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ جن کے خطوط میں خصوصیات ضرور ملیں گی۔ مگر کوئی خاص طرز اپنے خاص نام سے آج تک مشہور نہیں ہوئی۔

تعلیم کتابت

اورنگ زیب نے سید علی خاں جواہر رقم متوفی ۱۰۹۴ھ سے اس فن کو حاصل کیا جس کے متعلق تذکرہ خوشنویساں میں یوں مذکور ہے:۔

"سید علی خاں جواہر رقم الحسینی گویند از تبریز است نام پدری آقا مقیم است کہ علم خط در ولایت تکسیب کردہ بر ویہ آنجا مے نوشت و بر ویہ میر عماد بسیار مشق کردہ و چلہا کشیدہ و شوق تحصیل خط زیادہ از حد داشت۔ تا خطش بایں پایہ رسید۔ در اوائل عہد پادشاہی عالمگیر در ہند آمدہ مشہور گردید خطش بمرتبہ مانی و نقش بہزاد است کہ ایں سیاہ قلم کار خوب استاد است۔ عالمگیر او را باستادی شاہزادگاں برگماشت۔ رفتہ رفتہ بخدمت نویسی داراد ہمگی کتاب خانہ سرفراز حاصل نمود۔۔۔"

اس تحریر کے بعد مصحح تذکرہ خوشنویساں یوں فرماتا ہے کہ:۔

"آنچہ از کتب دیگر مثال مرات العالم وغیرہ رسیدہ اینکہ میر سید علیخاں جواہر رقم در عہد صاحبقران ثانی شاہجہان وارد ہندوستان گشت و از حضور وی بخطاب جواہر رقمی مشرف گشتہ بتعلیم محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر مامور شدہ سرامتیاز برافراشت۔ در عہد سلطنت عالمگیری بداروغگی کتاب خانہ مقرر شدہ۔ و طبع شعر نیکو داشت۔ در سنہ یک ہزار و نود و چہار ہجری بدار باقی شتافت"

سید علیخاں کے بعد اس کا لڑکا شمس الدین علیخاں بھی جواہر رقم کے خطاب سے سرفراز ہوا۔

اورنگ زیب کے ذاتی علم خوش نویسی کے متعلق اس کا اپنا مؤرخ منشی کاظم اپنے عالمگیر نامہ میں مفصل لکھتا ہے:۔

"از رتبہ خط و حسن تحریر آں شاہنشاہِ غلاطون فطنت سکندر نظیر کہ صفحات روزگار و اوراق دفاتر لیل و نہار از آں زینت پذیر است خامہ نکتہ پرداز جادو فن را چہ یارائے دم زدن بقدرت کلک بدائع آثار معنی استاد و سحر نگاری را چناں برکرسی نشاندہ کہ دست استاداں اقالیم سبعہ بداں نتواند رسید۔

قطعہ نسخ آں حضرت کہ رقم نسخ خط یاقوت یا صیرفی تواند بود در غایت پختگی و مزہ و متانت و اسلوب است و کمال قدرت در نوشتن آں دارند و اکثر اوقات توفیق ثواب اندوزی کتابت کلام اللہ از ضمائم عبادات آں شہنشاہ دین پناہ است۔

خط نستعلیق:۔ آں حضرت بے شائبہ اطرائے مدح طرازی و اغراق نکتہ پردازی دراں رستہ است کہ قطعہائے کہ در عین ایام ذوق و سرگرمی مشق رقم پذیر خامہ اشرف گشتہ بقطعہائے خوب استاداں کہ عمر گرانمایہ صرف تحصیل آں سرمایہ ساختہ بتکمیل امرے دیگر نپرداختہ اند در نظر خط شناسان مبصر مشتبہ مے شود و شکستہ نستعلیق در غایت مغز داری و صفا و متانت و پختگی مے نویسند۔

اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن کریم

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ عالمگیر اورنگ زیب خود قرآن کریم لکھ کر مکہ مکرمہ ارسال کیا کرتا تھا۔ جس سے عام لوگ اس کے صاحب ریاضت و محنتی ہونے کی دلیل لیا کرتے ہیں۔ اس کے متعلق اس کے اپنے تاریخ عالمگیر نامہ میں یوں مذکور ہے اور اس سے اس کے تخت نشین ہونے سے قبل اور مابعد دونوں زمانوں میں ثبوت ملتا ہے کہ وہ لکھتا تھا۔ جیسا کہ تاریخ میں یوں ہے:۔

قبل بادشاہی:۔ "صفحے مجید بخط مبارک صورت اتمام دادہ آں را۔۔۔ بمکہ معظمہ مشرف

زادہا اللہ قدراً وجلالہ فرستاند۔"

اور بعد میں :- وراندک وقتے بدستیاری تائید و مددگاری بخت سعید جلدے دیگر از مصحف مجید باتمام رساندہ۔

اس کے بعد :- قرآن مجید بخط اقدس کہ مبلغ ہفت ہزار روپیہ بر لوح وجدول وجلد آں صرف شدہ بمدینہ منورہ مرسل شدہ۔"

ان تحریروں سے اس کے حسن مذاق خطاطی اور پھر اس پر زر کثیر خرچ کر کے اس کو مزین کرنا اس کے فن ہذا کے ہی نہیں بلکہ فنون لطیفہ کی عام دلفریبی کی علامت ہے۔ کہ پروردگار نے اس کو کس قدر اعلیٰ دماغ دیا تھا کہ ان تحریروں کو وہ سجانا اور ان کو کماحقہ اعلیٰ طریقہ میں رکھنا جانتا تھا۔

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن کریم کہاں گئے۔ کیا لوگوں کے ہاں کتب خانوں میں موجود ہیں؟ تاریخی الفاظ سے یہ امر کوئی شبہ نہیں چھوڑتا کہ مکہ و مدینہ منورہ ارسال کر دئے گئے۔ باقی رہا کہ دیگر قرآن جو آج کل رونما ہو رہے ہیں کیا وہ صحیح ہیں؟ میری اپنی ذاتی رائے ہے کہ ان کے اصل ہونے میں شبہ کی گنجائش ہے۔ میری تائید میں سب سے بڑھ کر ان تحریروں کا قلع و قمع کرنے کے لئے اورنگ زیب عالمگیر کا اپنا ذاتی ایک رقعہ موجود ہے جسے اس نے اپنے لڑکے کو خطاب کیا ہے اور اس سے واضح ہے کہ اورنگ زیب نے واقعی ایک دو قرآن کریم لکھے اور محض رضاء الٰہی کے لئے لکھے۔ پھر کسی وجہ سے ان پر نام یا تاریخ نہیں لکھے۔ یہ رقعہ میرے اپنے ذاتی نسخہ کلمات طیبات میں بالفاظ ذیل موجود ہے۔ امید کامل ہے کہ اس کے بعد کوئی شخص کسی مخطوطہ قرآن کو اس کی طرف منسوب کرنے سے گریز کرے گا۔

"چہ بنویسم وچہ بگویم خجالت و انفعال ایں نام بد نامے گفتہ مانوشتن اسم بر سم آں بر سم اولی وانسب من یک دو مصحف کہ نوشتہ ام نام ننوشتہ ام تاریخ ہم نوشتن درکار نیست اگر برائے او سجانہ نوشتہ اند

علم او حسبی یکفی ۔" ۱۴۲

دیگر خطاط

اس کے علاوہ دیگر مشاہیر خطاط کا ذکر غلام محمد ہفت قلمی نے کیا ہے۔ جو اورنگ زیب کے عہد میں درجہ کمال پر تھے جیسا کہ:۔

"درعہد شاہجہاں بادشاہ عبداللہ مشتہر بہ عبدالباقی حدّاد در دورۂ اخیر گوئی سبقت از نسخ نویساں ربودہ۔ خط نسخ را عروس الخط گردہ آرائش وزینت دیگر بخشید۔ درہندوستان آمدہ بجناب شاہزادہ اورنگ زیب بہادر نوشتہ خود قرآن سی ورقی و کلام اللہ وصحیفہ وغیرہ گزرانیدہ مخاطب بیاقوت رقم شدہ بوطن معاودت کرد۔ چند کسے از شاگردان رشید خود بحضور گذاشت۔ اکثر بخطاب یاقوت رقمی و یاقوت رقم خانی سرفرازی یافتہ اند۔"

محمد عارف المخاطب بہ یاقوت رقم خاں از شاگردان عبدالباقی حدّاد است درعہد شاہ عالم (۱۱۲۴-۱۱۱۹) حلف عالمگیر بادشاہ بخطاب یاقوت رقم خانی امتیاز یافت درخط نسخ شیوہ خاص اختراع نمودہ کہ درہندوستان رواج یاقوت از ابنائے قرن ثانی عشر است۔

اورنگ زیب نے خصوصیت سے اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے ہدایت اللہ زریں رقم کو مقرر کردیا تھا۔ جو اکثر محمد حسین کشمیری کے طرز پر لکھتا تھا۔ مگر بعد میں اس نے سید علیخاں جواہر رقم کا خط اختیار کرلیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ کتب خانہ عالمگیر کا داروغہ ہوگیا تھا۔ اور آپ کے تلامذہ میں سے شاہزادہ کام بخش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کو بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ اپنی قلم سے محمد کام بخش کی بیاض میں رباعی ذیل درج کرے:۔

آتش بدود دست خویش و رخرمن خویش　　من خوردہ ام چہ غم اگر دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش　　اے وائے من و دوست من و دامن خویش

اس سے اورنگ زیب کا حسن انتخاب اور پاکیزہ مذاق ملاحظہ ہو۔ ہدایت اللہ کا انتقال ۱۱۸۰ھ میں بمقام احمد نگر ہوا۔ اگرچہ فن میں اپنے استاد سے بڑھ گیا تھا مگر کبھی تکبر نہیں کرتا تھا۔

اواخیر زمانہ تک یہی سلسلہ نظر آتا ہے کہ شاہان مغلیہ اپنی اولاد کو خوش خطی خاص طور پر سکھلاتے رہے چنانچہ اسی ہدایت اللہ کے ذکر میں ہفت قلمی نے تحریر کیا ہے

"دراں زمانہ اکثر شاہزادہا و پسران محمد اعظم شاہ وغیرہ شاگردان ایں بزرگوار خوب نوشتہ اند"

اگر اس فن کے متعلق اور کوشش کی جائے تو بہت سا مواد مل سکتا ہے مگر مختصر پر اکتفا کر کے یہی کہنا پڑے گا کہ اگرچہ یہ فن خوب تھا مگر ماقبل سے یہ ضرور فن کے اعتبار سے وہ حسن اور توازن اپنے اندر نہیں رکھتا تھا۔

دہلی کے عجائب خانہ آثار قدیمہ میں ایک قرآن کریم کا نسخہ محمد عارف یاقوت رقم خاں مورخہ ۱۰۸۰ھ کا لکھا ہوا ہے۔ محمد عارف بخطاب یاقوت رقم خاں ہرات کا باشندہ تھا۔ اور عبدالباقی حداد کا بہترین تلمیذ تھا۔ یہ اورنگ زیب کے شاہزادوں کا اتالیق خط بھی تھا۔ انہوں نے اس سے خط نسخ سیکھا اور میر سید علی سے نستعلیق سیکھا۔ مصنف حالات خوشنویساں کا بیان ہے کہ میں نے شہزادوں کا قرآن و پنج سورہ کا نسخہ محمد عارف کے رسم الخط پر لکھا ہوا دیکھا۔ یاقوت رقم خاں کا لقب آپ کو شاہنشاہ شاہ عالم بہادر شاہ نے دیا تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے۔ دہلی میوزیم میں ایک وصلی ۱۰ عباد اللہ شاگرد یاقوت رقم خاں کی ہے جو اس کی ہمشیرہ کا لڑکا بھی تھا۔ دو اور وصلیاں ۱۱۱۲ھ قاضی عصمت اللہ اور اس کے بھائی فیض اللہ کی مختلف خطوں میں ہیں۔ ہر دو اسی محمد عارف کے تلمیذ تھے۔ یہ واضح ہے کہ عصمت اللہ کے خط سے سید امام علی رضوی اور اس کا لڑکا جلال الدین رضوی بہت متاثر ہوئے۔

دہلی کے عجائب خانہ میں ایک بیاض بختاور خاں متوفی ۱۰۹۶ھ کی خط نستعلیق اور شکستہ کے بہترین

نمونوں پر مشتمل ہے۔ بختاور خاں اورنگ زیب کے بڑے درباری امراء میں سے تھا۔ اس بیاض میں سید علی جواہر رقم مذا کا نمونہ ہے۔ سید علی تبریز کا باشندہ تھا۔ عہد شاہجہاں میں ہند میں آیا اور شاہزادہ اورنگ زیب کا اتالیق مقرر ہوا۔ شاہجہاں نے اسے جواہر رقم کا لقب دیا تھا۔ اس بیاض میں دیگر اکثر مشاہیر خوشنویس وقت کے نمونے ہیں۔ چنانچہ محمد امین مشہدی کا ایک قطعہ مورخہ ۱۰۸۲ھ اس قطعہ میں بیاض مذکور کے تدوین ہونے کی تاریخ ہے ؎

ہوالعزیز

ایں طرفہ بیاض من سواد اعظم	مجموعہ واردات اہل عالم
ویں برہم کہ گفت بختاور خاں	تاریخ بیاض خود سواد اعظم

ایک وصلی محمد باقر جو اورنگ زیب کے دربار کا خوشنویس تھا۔ بادشاہ اس کے خط کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس بیاض میں ایک قطعہ تاریخ بیاض ہذا محمد اسمٰعیل عاقل مورخہ ۱۰۸۳ھ کا ہے۔ غالباً یہ حاجی اسمٰعیل کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اورنگ زیب کے فرمان لکھا کرتا تھا۔ اس کو روشن رقم لقب ۱۰۹۶ھ میں ہوا تھا۔

متذکرہ بالا محمد باقر کا لکھا ہوا ایک قطعہ نسخ میں مولوی محمد عنایت اللہ وارثی کے مجموعہ میں ہے۔ جس پر نام یوں ہے :۔

"سید محمد باقر از شاگردان طلا زادہ ۱۱۰۱ھ"

میرے کتب خانہ میں کتاب موسومہ "فرامین عالمگیر" میں ایک تحریر حسب ذیل ہے :۔

"دو قرآن مجید یکی بقلم طلا و دوم حمائل بخط شاگرد محمد رضا کہ فرزند عالیجاہ خوش کردہ بود و تصحیح بقدر مقدور شدہ۔ با دو چہل حدیث کہ ایں حدیث العبد جمع نمودہ یکی پیش از انداختن قلادہ ولایت کثیر الخطیر۔

ازیں امر خیلے کہ مترجمت و فوائد دیگر نہ نوشتہ شدہ مصحوب شاہ میر پسر سید باقر خوش نویس سکینہ بانو بیگم خالہ ایشاں کہ سوانح نویس شدہ بابا رانی فرستادیم سقلاطۃ تازہ از فرنگ آمدہ بود باز نچرہ کا آنجاست وجہ نویسانیدن قرآن عظیم بقلم طلا اینست کہ در خطبہ عدہ مولف نوشتہ کہ ایں نسخہ را بسیاہی دیدہ باید نوشت چوں ایں میسر نیست بقلم طلا نویسانیدہ شد تصحیح خاطر خواہ نشدہ چہل حدیث مترجم را بغور در وقت صافی بہ جمعیت مطالعہ نمایند۔"

اب اس متذکرہ بالا تحریر سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ عالمگیر کو کس قدر خطاطی سے شغف تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر امیر و شاہی خاندان کے فرد کے ہاں خوشنویس ہوتے تھے۔ جو سوانح وغیرہ لکھنے پر مامور تھے۔ محمد رضا خوشنویس غالباً عہد جہانگیر سے تعلق رکھتا ہے۔ جو بہترین مصوّر و کاتب تھا۔

اس بیاض میں دیگر وصلیاں سید احمد۔ محمد نعیم اصفہانی۔ محمد صادق۔ میر حبیب اللہ۔ مولراج مورخہ ۱۰۹۹ھ۔ ہدایت اللہ زریں رقم مورخہ ۱۱۱۲ھ کی نستعلیق میں ہیں۔ مگر اس بیاض کے دیگر نمونے خط شکستہ کے بعض انہیں خطاط کے ہیں جن کے نستعلیق میں بھی ہیں۔ مگر میں یہاں انہی کے اسماء پر اکتفا کرتا ہوں جو خط کے ضمن میں بالکل نئے ہیں۔ جن میں سے عبداللہ الملقب بدارابت خاں اس کے والد محمد جعفر بھی خوشنویس تھے۔ اور ان کو کفایت خاں کا لقب تھا۔ اور محمد حسین کا جانشین تھا۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ہند میں خط شکستہ اسی نے رائج کیا۔ ایک قطعہ نواب اشرف خاں[1] جو شاہجہاں و اورنگ زیب کا درباری امیر تھا۔ اس کا پورا نام میر محمد اشرف تھا مگر اورنگ زیب نے اسے اشرف خاں کا لقب دیا تھا۔ اس کا انتقال ۱۰۹۷ھ میں ہوا۔ ایک قطعہ نورالدین محمد مورخہ ۱۰۸۱ھ کا ہے۔ جو نواب اشرف خاں کا تلمیذ تھا۔ ایک قطعہ سید احمد۔ ایک قطعہ مرزا معزالدین محمد فطرت۔

شاہنشاہ عالمگیر کی اولاد میں سے اس کی بیٹی زیب النسا ایک عالم فاضل کی حیثیت سے ہمہ صفات

[1] اس نام سے اور خطاطی اکبر کے عہد میں ملتا ہے جو سب طرز میں خوب لکھتا تھا۔ اور فرمان نویس تھا۔

اپنے اندر رکھتی تھی۔ اور تمام خاندان مغلیہ میں ایسی کوئی عورت نہیں ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے اس نے آقا عبدالرشید دیلمی متوفی ۱۰۸۱ھ سے نستعلیق سیکھا تھا۔ میں نے ایک قطعہ مالک الدیلمی کا لکھا ہوا اسی عہد کا ایک دوست کے ہاں دیکھا۔ غالباً یہ مالک اسی عبدالرشید کے خاندان یا اعزہ میں سے تھا۔ زیب النسا علماء و فضلاء و شعراء کی قدردانی میں بیحد صرف کرتی تھی۔ اس نے صرف کثیر سے اکثر نایاب کتب کی نقلیں ایران و توران سے بہم پہنچائی تھیں اور ایک بے نظیر کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اور کتابت کا دفتر کشمیر میں ملا محمد شفیع کی نگرانی میں قائم کیا تھا۔ وہاں سے کتابیں نقل ہوکر دہلی آتی تھیں۔ اور شاہزادی کے ملاحظہ کے بعد کتب خانہ میں رکھی جاتی تھیں۔ ملا محمد شفیع اور ملا عنایت احمد نے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھ کر اس کو زیب التفاسیر کے نام سے موسوم کیا اور اس خوبصورتی سے آراستہ کیا کہ شہنشاہ عالمگیر دیکھ کر پھڑک گیا۔ یہ بے نظیر نسخہ ابھی تک دولت ایران کے کتب خانہ میں ہے[1]۔

عہد شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے بہترین خطاط نوراللہ ناموں سے ملتے ہیں ایک تو حافظ نوراللہ اور دوسرا شیخ نوراللہ جو عبدالرحیم فرمان نویس کا تلمیذ تھا۔

اورنگ زیب علاوہ خط سے دلبستگی ہونے اور بذات خود خوشنویس ہونے کے قدیم اساتذہ کے بہترین نمونوں کو بھی بہت پسند کرتا تھا اور ہمیشہ ان کو مدنظر رکھتا تھا۔ چنانچہ حاجی علی شیرازی جو خط نسخ کا خوشنویس تھا۔ اس کے ہاتھ کا ایک شاہنامہ ۸۹۹ھ کا لکھا ہوا آپ کے پیش نظر رہتا تھا۔ یہ شاہنامہ کسی زمانہ میں شاہ اودھ کے پاس پہنچا تھا۔ اب علم نہیں کہاں ہے۔ یہ عالمگیر کی تحریریں اور مہروں سے مزین رہتا تھا۔ (زمانہ دسمبر ۱۷۱۲ء)۔

عنایت اللہ خاں ولد مرزا شکر اللہ کشمیری مؤلف کلمات طیبات عالمگیری کتاب میں سے تھا۔ اس کی والدہ حافظہ مریم نہایت تعلیم یافتہ اور باضابطہ خاتون تھی جسے شاہزادی زیب النسا بیگم کی

---

[1] حیات زیب النسا مطبوعہ لاہور ص ۱۱۱

استادی کا فخر حاصل تھا۔ عنایت اللہ خصوصیت سے انشاء والا کے کمالات سے پیراستہ تھا۔ اس کا انتقال ۱۱۳۹ھ میں ہوا۔

فضائل خاں عالمگیری جن کا اصلی نام میر ہادی اور فضائل خاں خطاب تھا۔ شاہزادہ معظم کی سرکار میں ملازمت اختیار کی تھی۔ اور داروغگی کتب خانہ اور خدمت میر منشی سے مفتخر تھا۔ ۶ ذیقعدہ ۱۱۱۴ھ میں انتقال کیا۔ یہ شخص عربی فارسی کا بہت بڑا فاضل تھا اور خط میں بہت ہی ماہر تھا خصوصیت رسم الخط ہندی میں ان کا فرمانا کہ کسی لفظ کے آخر میں حرف ھا نہیں آتا ہے۔ محض فارسی نویسوں نے از روئے سہو الف کو ہ سے بدل دیا ہے۔ مثلاً بنگالا، مالوا کی جگہ بنگالہ اور مالوہ لکھا جاتا ہے عالمگیر نے بھی اس کی تقلید کی مگر غلط العام فصیح والا معاملہ ہے۔ اس کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جس کی ایک کتاب "منہاج امام نووی" جو قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی تھی ندوۃ العلماء کی نمائش ۱۹۰۶ء میں پیش کی گئی تھی (زمانہ فروری ۱۳ء)

خط کے اقسام : خط دیوانی

چنانچہ مسلمانوں کے درباروں میں جو کاغذات بصورت دستاویز، فرمان واحکام تیار ہوتے تھے، ایرانیوں کے نقش قدم پر اس طرز کا نام خط دیوانی رکھا گیا۔ جس کی تعریف اندرام مخلص متوفی ۱۱۶۵ھ نے یوں کی ہے:۔

"خط دیوانی عبارت است از خط شکستہ کہ اہل دفاتر ایران می نویسند وآں پیچ دار می باشد۔ تا دیگرے بآں وضع نتواند نوشت۔ مرزا وحید گوید ؎

زپیچ وتاب نگر وصف خط جاناں را
دریں بیاض نوشتم بخط دیوانی

اس کی وضاحت مصنف بہار عجم نے یوں کی ہے :-

"خط دیوانی خط شکستہ پر زشت ناخواں مخصوص مرزایاں دفتر کہ ارباب دفاتر ایران دارند تا دیگرے نقل بآں نتواند کرد۔ لہٰذا در ہما نجا رائج است"

اس تائید میں اس نے مرزا صائب۔ محسن تاثیر۔ طالب آملی کے اشعار بھی دیئے ہیں۔ غرضیکہ اس خط کی غرض وغایت یہ ہے کہ آسانی سے کوئی نقل نہ کر سکے۔ اور اسے اہل ایران نے دفاتر کی دستاویزوں کے لئے اختراع کیا مگر دراصل یہ خط شکستہ کی طرز ہے۔ اور ماہرین فوراً ان خصائص کی وجہ سے پہچان لیتے ہیں جیسا کہ ان دونوں خط دیوانی اور خط شکستہ کے لکھنے والوں میں۔ ایک مرزا محمد شفیع الحسینی ۱۰۶۲ھ کا ہے جسے شفیعا کہتے تھے۔ اور دوسرا کفایت خاں محمد جعفر ہے۔ اوّل ایرانی ہے اور دوسرا ہندوستانی۔ دونوں میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔

خطِ شفیعا شکستہ

محترم ڈاکٹر مہدی بیانی، مہتمم کتب خانہ ملی طہران مملکت ایران نے ایک مجموعہ نمونہ کے لئے مختلف طرز خط شائع کیا ہے۔ جو عام طور پر وہاں کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کا یہ کارنامہ بہت گراں قدر علمی خدمت ہے۔ اوّل تو انہوں نے ہمیں ان طرزوں سے روشناس کرایا پھر ان کے ساتھ معلومات بھی بہم پہنچائیں جو ان خطاطوں کے حالات زندگی سے متعلق ہیں۔ انہوں نے اس مجموعہ میں محمد شفیع معروف بہ شفیعا کے نمونے خط نستعلیق اور خط شکستہ کے تحت دیئے ہیں۔ جن میں سے ایک خالص خط شکستہ کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور آپ کے مختصر حالات شکستہ نویساں کے تحت لکھے ہیں۔ اوّل ایک امر واضح معلوم ہوتا ہے کہ جسے ہم نے خط دیوانی بیان کیا ہے وہ دراصل صرف عام خط تعلیق ہے اور پختہ شکستہ طرز اس سے کسی قدر مختلف ہے۔

محمد شفیع الحسینی معروف بہ شفیعا سادات حسینی ہرات سے تھا۔ اور اس وجہ سے لقب پیشوا سے مشہور تھا۔ مشق خط کے ضمن میں مرزا فصیح شاعر کا تلمیذ تھا۔ جو مرتاض قلی خاں شاملو کی دستگاہ ہرات میں ملک الشعراء تھا۔ اور بلا فصل مرزا ابوتراب اصفہانی کا تلمیذ تھا۔ بعضوں نے اسے میر عماد کا خلیفہ بھی تسلیم کیا ہے۔ شفیعا خط نسخ۔ تعلیق اور شکستہ لکھنے میں بہت ماہر تھا۔ خاص کر خط شکستہ کو کسی نے بھی اس کے بعد اس خوبی اور درستی سے نہیں لکھا۔ اس کا یہ شکستہ طرز تحریر بجائے خود اس کے نام پر شفیعا کے نام سے مشہور ہوگیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشعار نہایت عمدگی سے پڑھتا تھا۔ فنی نقاشی۔ مطلا کاری۔ مذہب کاری وغیرہ میں بہت دسترس رکھتا تھا۔ جس کے اکثر نمونے ملتے ہیں۔

اس نے ہندوستان میں بھی قدم رکھا اور بقول سنگلاخ اس نے گجرات میں قیام کیا۔ پھر ایران واپس جاکر کافی مدت اصفہان میں قیام کیا جس کے بعد اسے عباس ثانی کے دربار میں خوشنویس مقرر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی نسبت سے اس نے اپنے بعض کارناموں پر لفظ "عباسی" سے تمیز کی ہے۔ غرضیکہ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا کاتب تھا۔

اس نے ۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی جسے والہ نصیر آبادی نے ۱۰۸۱ھ سے تعین کیا ہے مگر بقول ڈاکٹر مہدی بیانی اس کے بعض ایسے قطعات بھی ملتے ہیں جن پر اس کے بعد کے دستخط محمد شفیع الحسینی ۱۰۸۶ھ اور ۱۱۲۸ھ کے الفاظ درج ہیں۔ ان کے نزدیک یہ محمد شفیع الحسینی اور شخص ہے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ شفیعا کے نام اور طرز شفیعا کو بہت فروغ ہوا۔

لوگوں کی متفق رائے ہے کہ شفیعا نے اپنے آپ کو خط کی مشق میں اس طرح وقف کر دیا تھا کہ وہ ہر جگہ مشہور ہوا۔ اور لوگوں نے اس کی ہمیشہ عزت کی۔ اس نے خط میں وہ رعنائی اور نفاست پیدا کی کہ وہ ضرب المثل ہوگیا۔ حتیٰ کہ لوگ ہمیشہ غلبہ کے طور پر خط کے ذکر میں شفیعا کی مثال دیتے۔ مگر

پچھلی صدی سے ہی طرز میں خاصہ انحطاط ہوا۔ اور لوگوں نے ان اصول کتابت میں جنہیں اساتذہ نے قائم کیا تھا کافی انتشار پیدا کیا۔ یعنی آج کوئی طرز خالص نہیں کی جا سکتی۔ اس شفیعا طرز پر لکھنے والوں کی فہرست میں درویش عبدالمجید طالقانی۔ سید محمد داؤد الحسینی وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کے نمونے آج بھی موجود ہیں۔

خطِ شکستہ

مغل دربار کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے کہ یہاں جو فرامین اور درباری دستاویزیں تیار ہوتی تھیں وہ زیادہ تر خط نستعلیق میں تھیں مگر ان فرامین کے پچھلی طرف یا ان کے متعلق اندراج وغیرہ جسے اصطلاح میں تعلیقہ کہتے ہیں عام طور پر خط دیوانی یعنی خط شکستہ میں درج کیا جاتا تھا۔ چنانچہ انند رام مخلص نے مراۃ الاصطلاح میں خط شکستہ کو یوں بیان کیا ہے :۔

"خط شکستہ نوعی است از خط نوشتن کہ پیچدار باشد۔ مرزا صائب رخ گفتہ ؎

مرا ز تجربہ کاراں نصیحتی یاد است
کہ تو بہ نامہ بخط شکستہ می باید

اقسام خط شکستہ بسیار است۔ در ہندوستان کفایت خاں و اشرف خاں ایں خط را خوب نوشتند چنانچہ قطعہ ہائے ایشاں سرمشق اہل فن است و حالانکہ سنہ یک ہزار یک صد و پنجاہ و ہفتم است مرید خاں خوب می نویسد و خانصاحب عبدالمجید خاں کہ دیوان تن و از قدیم مہربان بر احوال۔

راقم حروف ایڈیٹر شوق بایں خط دارند و خوب می نویسند قطعہای نوشتہ ایں ہر دو بزرگ در مرقع فقیر است۔"

یعنی بقول انند رام مخلص ہندوستان میں دو آدمی اشرف خاں اور کفایت خاں خط شکستہ کے

لکھنے میں ماہر تھے جو اس سے پہلے ہو گذرے تھے۔ ہم نے اشرف خاں کا ذکر اکبر کے دربار کے فرامین کی تسوید کے ضمن میں اوپر بیان کر دیا ہے۔ مگر کفائت خاں کے حالات ہمیں شاہجہان کے عہد کی تاریخ عمل صالح اور اورنگ زیب کے عہد کی کتب میں بھی ملتے ہیں۔

کفائت خاں کی ایک بیاض کا ذکر:۔

"بیاض بخط کفائت خاں جعفر مصحوب دخان مذکور قبل ازیں بموجب حسب الحکم اعلیٰ معروض داشتہ دریں ولا فرمان معلی رفت کہ نسخہ صد پند لقمان حکیم بخط خوب دلی مشبہۂ ملا میر علی را کہ طاہرا پیش ازکدای رابعۃ الدورانی غفر اللہ لہا نہ بدو سال اتباع شدہ۔ وکتاب قوام الملک کہ یکی از مشائخ ہندوستان کہ علم ظاہری نیز داستہ تالیف نمودہ نزنجا بمسطور حوالہ شد۔ چوں اوراسہ بود معاملہ تصحیح کتاب قوام الملک کہ نصائح ملوک السلاطین است واصل کتاب تصحیح قابلخاں است، بسر شد۔ اگر سقمی ظاہر شود بسازند از اول تا آخر بتامل وتدبیر مطالعہ کنند وثمرہ علم عمل دانند بقدر مقدور درکریمہ "لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا" تامل فرمایند کہ آنچہ ما موریم درآں حق در معصریم۔ باللہ التوفیق۔ (از نسخہ روزگار)

یک جلد قرآن مجید دو جلد دیوان شیخ محی الدین عربی مثنوی و دو مرقع بخط خود دو قبضہ شمشیر پیش کش بہ سرکار سپہر اقتدار نمودہ حکم جہاں مطاع جہانیاں مطیع صادر شد کہ اسامی نسب وگرامی حسب مصحف مجید ایشار مذکورہ را بحضور ساطع النور بعرض رسانند (از نسخہ روزگار)۔

کفائت خاں

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا جعفر مخاطب بکفائت خاں اور جلال الدین یوسف تلامذہ محمد حسین میں سے تھے۔ خط شکستہ اور نستعلیق لکھنے میں ان کے پایہ کا کوئی بھی نہیں تھا۔ کفائت خاں اپنی تحریر

کی مراد اور استخوان بندی میں بہت ہی ماہر تھا۔ اس کے خط میں شکستگی ایک خاص وصف تھا۔ جس کی وجہ سے اسے اس طرز خط میں منفرد سمجھا جاتا تھا۔ سبحان رائے بھنڈاری بٹالوی نے محمد جعفر المخاطب بکفائت خاں بن مقیم خاں بنیہ مرزا محمد حسین ولد مرزا شکر اللہ قرابت داراں مصنف حبیب السیر تھا۔ جو بعض امرائے صفویہ کے حسد کی وجہ سے بعہد محمد خدابندہ بن شاہ طہماسپ بن شاہ اسمٰعیل ہندوستان آگیا۔ اور ہمایوں کے عہد میں آکر امرائے کبار میں منسلک ہوگیا۔ یہ شخص خط نستعلیق۔ تعلیق اور ثلث وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس سے پیشتر ہندوستان میں خط شکستہ کے لئے کوئی اسلوب و سلیقہ وضع نہ تھا۔ بلکہ مشہور اقسام طرزہائے خط میں شکستہ کا کوئی شمار بھی نہ تھا۔ مرزا محمد حسین نے سب سے اوّل یہاں اس طرز کو خوب عمدگی سے لکھا اور درجہ کمال تک پہنچایا کہا جاتا ہے کہ اس کا انتقال یہیں ہوا۔ غرضیکہ کفائت خاں اسی مرزا محمد حسین کا بنیہ اور محمد مقیم کا لڑکا تھا۔ یعنی وہ نجیب الطرفین خطاط تھا۔

کفائت خانی

محمد جعفر کو شاہجہاں کے زمانہ میں درباری دستاویز اور فرامین کی تسوید پر مقرر کیا گیا۔ اور اپنے حسن کارکردگی کی وجہ سے اسے جو خدمت دیوانی اور خاصہ شریفہ میں ۲۵ سال تک انجام دی تھیں اس کے صلے میں کفائت خاں کا خطاب عطا ہوا۔ اس تمام عرصہ میں اس نے بالخصوص خط شکستہ کے لکھنے میں بہت نام پیدا کیا ہے جسے عرف عام میں "کفائت خانی" کی اصطلاح سے بھی یاد کرتے ہیں۔ جس طرح ایران میں محمد شفیع الحسینی کے خط کو خط شفیعا سے یاد کرتے ہیں۔ (حالانکہ دونوں طرز خط شکستہ کہلاتے ہیں)۔ کفائت خاں کا انتقال ۱۰۹۵ھ میں شاہجہاں آباد دہلی میں ہوا۔ اور اسے اس کی اولاد نے دفن کیا۔

ہم یہاں کفائت خاں کے خط شکستہ کا ایک نہایت عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جو ایک مکمل نسخہ گلستان سعدی ہے۔ جو راقم کے کتب خانے میں ہے۔ جس کو اس نے اپنے لڑکے کے لئے لکھا۔ اس کے آخر الفاظ جو بہت ہی اہم اور دلچسپی سے خالی نہیں ملاحظہ ہوں۔

شب پنجشنبہ ۲ محرم الحرام ۱۰۸۶ھ در دار الخلافۃ شاہجہاں آباد باتمام رسید۔

ایں نسخہ شریف را اقل العباد محمد جعفر ملقب کفائت خاں بجہت زندگی عبداللہ نوشت و باو تملیک نمود کہ بمحافظت بطریق یادگار نگاہ دارد و ہیچ نبخشد و بعاریۃ بکسے ندہد

درایت خانی

متذکرہ بالا ترقیمہ گلستان میں کفایت خاں نے خود اپنے ایک لڑکے عبداللہ کا ذکر کیا جس کیلئے اس نے اسے تحریر کیا۔ اور اس کی ملک میں دیدیا۔ کفایت خاں کے اس لڑکے کو بھی اورنگ زیب کے دربار سے "درایت خاں" کا لقب ملا تھا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح خط شکستہ کے لکھنے میں ماہر تھا۔ جسے عوام بہت پسند کرتے تھے۔ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ وہ اپنے باپ دادا سے بھی سبقت لے گیا۔ اس کے خط کی نزاکت۔ کرسی بندی۔ قلم میں متانت علم خطاطی میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ اس نے ایجاد۔ وضع و اسلوب الگ اختراع کئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ملا میر علی اس خط شکستہ کو دیکھ لیتا تو وہ اپنا ہاتھ خط نستعلیق کے لکھنے سے کھینچ لیتا۔ اسی وجہ سے اس کے شکستہ لکھے ہوئے کو عام طور پر "درایت خانی" اس کے باپ کے لقب کفائت خانی کے وزن پر کہتے ہیں۔ مگر بقول فرانسیسی موسیو ہیور دونوں میں فرق ہے۔ اور سبقت اور اوّلیت کفائت خاں کو ہی حاصل ہے۔ اگرچہ اس کا لکھا ہوا بعض اوقات گل و ریحان بلکہ باغ و بہار معلوم ہوتا ہے۔"

کفائت خاں کا ایک لڑکا محمد اکبر علی تھا۔ وہ بھی اس طرز کے لکھنے میں خوب ماہر تھا۔ اس نے اپنی تحریر

کو اصول و آئین پر قائم کیا تھا۔ وہ بذات خود نہایت دلکش، نہایت دلچسپ شخص تھا۔ کفایت خاں کا ایک لڑکا میاں لال خاں تھا۔ جو شکستہ کو چند اصولوں پر لکھتا تھا۔ اور مثل زلف معشوقاں عنبریں پیچ در پیچ ہر صفحہ کو سلیستان بنا دیتا تھا۔

غرضیکہ اسی طرح شکستہ لکھنے والوں میں قابل ذکر اور لوگ بھی ہیں جنہوں نے عہد اورنگ زیب میں نام پیدا کیا۔ مگر ایک امر ضرور ماننا پڑے گا۔ کہ آج تک کفائت خانی اور درائت خانی خط شکستہ لوگوں کے زبان زد ہیں۔ اور ان طرزوں میں اہل ہند ایران کے اصحاب فضل و کمال سے بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ ہر دو کے نمونوں میں کسی قدر فرق بھی ہے۔ بہرکیف فیضان ہمیں ایران ہی سے ملا ہے۔

موسیقی

یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ جس قدر ماہرین فن علم موسیقی مسلمان ہوگذرے ہیں اور جس قدر اس فن لطیف پر کتب انہوں نے تصنیف کیں وہ کسی اور تاریخی دور میں کم ہیں۔ اس کے ثبوت کے لئے محض کتاب الاغانی جو اوّلین عہد کے خلفائے عباسیہ کی یادگار ہے اور اس کے بعد کی کتاب الفہرست ابن ندیم بھی قابل ملاحظہ ہے۔ اور یہی سلسلہ برابر جاری رہا۔ غرضیکہ ہندوستان میں مغلوں نے اس فن کی طرف خاص توجہ دی۔ چنانچہ اکبر کے عہد کا بہترین امام الفن میاں تانسین اور شیخ بیجو باورا مسلم ہیں۔

لاہور کے قلعہ کا بیان کرتے ہوئے اکبر کے عہد کے مؤرخین نے لکھا ہے کہ میاں تانسین اور شیخ بیجو باورا اکبر کو دلکش گانے حکیم علی گیلانی کے بنائے ہوئے حوض کے کنارے سنایا کرتے تھے جو اس نے ۱۵۹۳ء میں یہاں تعمیر کیا تھا۔ جس کے نیچے سیڑھیاں اور راستے بھی تھے۔ اور اکبر نے ان کو یہ حوض بیس کروڑ تنکوں سے لبریز کرکے عنایت کیا تھا۔ جن کے آج ہزاروں کیا بلکہ سب ماہرین موسیقی اپنا سلسلہ تلمذ ان تک منسلک کرکے فخر خیال کرتے ہیں۔ جہانگیر کے عہد کے ماہرین موسیقی کے متعلق اس کی تزک اور واقعات جہانگیری میں الگ ملتا ہے۔ شاہجہان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بذات خود فن موسیقی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ غرضیکہ اسی کش مکش میں اورنگ زیب کا زمانہ آجاتا ہے۔ جس پر تہمت لگائی جاتی ہے کہ اس نے موسیقی کا جنازہ نکال دیا۔ جو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی توجہ اس طرف کم تھی یا بالکل ہی نہیں تھی تو صحیح کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کو اس سے نفرت تھی یہ سراسر غلط ہے۔ اس کا فنون کو سمجھنا

مسلم ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اور اس دور کی خصوصیت عرض کر چکا ہوں۔ مگر مصوّری کے تحت میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ وہ ایک تصویر میں اپنے ایک خاص انداز میں خانگی زندگی میں گانا سُن رہا ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ مآثر عالمگیری سے واضح ہو جائے گا کہ اس کو نفرت تھی یا اس کے برعکس ہے۔ یہ الفاظ اس کی تخت نشینی کے وقت کے ہیں جن سے ہمہ تن اس کی دلفریبی فن کا ثبوت ملتا ہے[1]۔

"..... ہر کدام درخور حالت و رتبت باضافہای نمایاں و خطابہای اعزاز نشان سرمباہات برفلک سودند و بزمرۂ صلحاء و اتقیاء و شعراء و ارباب طرب و نشاط و سرود سرایان انجمن انبساط انعامات لائقہ و صلات گرانمایہ مرحمت شد"

اگر واقعی اس کی توجّہ باوجود اس کے بادر نہیں کی جاتی تو کہنا پڑے گا کہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص ہمہ اوصاف اپنے اندر رکھتا ہو۔ ماہرین فن نے جب دیکھا کہ دربار کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی یا قدر مندی نہیں ہوتی تو انہوں نے ایک جنازۂ موسیقی تیار کر کے بادشاہ کی نظر سے گذارا۔ بادشاہ سلامت نے دریافت کیا کہ کیا ہے تو معلوم ہوا جنازہ موسیقی ہے۔ تو آپ نے کہا اس کو بہت گہرا دفن کرو تاکہ آواز نہ آسکے" مگر اس نے باوجود یہ معلوم کرتے ہوئے بھی ہرگز ان کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ وجہ یہ تھی کہ لوگ درباری قدر دانی کے عادی ہو چکے تھے اور اس نے فنون کو درباری قیود سے آزاد کر دیا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ لوگ کسی طرح ان کاموں سے نکل کر خود انفرادی حیثیت سے اپنی ذمہ داری محسوس کریں۔ اس لئے عوام کو ممنون ہونا چاہیئے کہ فنون کو درباری اقتدار حاصل نہ رہا۔ مگر یہ یاد رہے کہ بعض ایسے فنون ہوتے ہیں جن کے قیام کے لئے درباری حوصلہ افزائی لازمی چیز ہے۔ جن میں سے موسیقی بھی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ موسیقی مغل دربار

[1] ۔ مآثر عالمگیری ص۲۴

سے نکل کر راجاؤں، نوابوں میں آگئی۔ اور موسیقار وہاں سے نکل کر دور دراز اطراف میں پھیل گئے۔ مگر باوجود اس قحط کے زمانہ میں بھی اورنگ زیب کے عہد میں بہت سے مشہور موسیقار مثلاً لعل خاں، جگن ناتھ وغیرہ نظر آتے ہیں جو میاں تانسین کے جانشین تھے۔ اور اپنے فن میں وقت کے امام تھے۔ اور حکومت کی طرف سے ان کی کوئی دلجوئی اگرچہ نہ تھی۔ اگر اکبر خود نقارہ بجا سکتا تھا، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے تو اورنگ زیب نے اورنگ آباد کی چار دیواری میں نقارخانہ قائم کرنے میں مطابق روایات قدیم تامل نہیں کیا۔

مآثر عالمگیری کے مصنف محمد ساقی مستعد خاں نے اورنگ زیب بادشاہ شریعت پناہ کے خصائل ومحاسن ونیز عادات کے ذکر کے تحت اختتام کتاب پر یوں لکھا ہے:۔

"بارگاہ شاہی میں نغمہ وسرود کے کل استاد ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور باکمال سازندے اور اہل نشاط کا ایک گروہ دربار میں ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ لیکن قبلہ عالم اس طرف بہت کم توجہ فرماتے تھے۔ ابتدائے عہد معدلت میں تو کبھی کبھی نغمہ وسرود سن بھی لیتے تھے لیکن آخر میں اس سے بالکل تائب ہو گئے تھے۔ ارباب نشاط کے گروہ میں سے جو شخص پیشہ سرود سے توبہ کر لیتا حضرت اس کو مدد معاش کے طور پر کچھ جاگیر عطا فرماتے تھے۔ مرزا اکرم خاں صفوی موسیقی کا بہترین ماہر تھا۔ قبلہ عالم سے سوال کیا کہ نغمہ وسرود کی بابت حضرت کی کیا رائے ہے۔ قبلہ عالم نے فرمایا کہ جو اس کے اہل ہیں ان کے لئے حلال ہے۔ مرزا نے عرض کیا کہ پھر حضرت اہل ہونے کے باوجود کیوں اس سے پرہیز فرماتے ہیں۔ قبلہ عالم نے جواب دیا کہ تمام راگ راگنیاں بغیر مزامیر اور خصوصاً پکھاوج کے مزہ نہیں دیتیں اور مزامیر بالاتفاق حرام ہیں۔ حرمت مزامیر کی وجہ سے میں نے نفس سرود سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ (مآثر ۳۸۳)

مآثر عالمگیری ۳۸۳-۳۸۴

بعض مؤرخین نے اس ضمن میں بالکل بے بنیاد باتیں لکھی ہیں اور اپنی حدود سے نکل کر اصل موضوع کو بھی انہوں نے اپنی حد سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ میخوخی نے لکھا ہے۔ اورنگ زیب نے موسیقی کے بند کرنے کا حکم دیا کہ اگر کوئی خلاف ورزی کرے گا تو اس کو سزا دی جائے گی۔ اور ساز توڑ دئے جائیں گے۔ جس کی بنا پر لوگوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ باوجود اس کے امراء پوشیدہ طور پر گانا سننے سے باز نہیں آئے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ بھی درج کرتا کہ بادشاہ کے حکم سے کن کن ماہر موسیقی کو سزا دی گئی یا سننے والے کو رسوا کیا۔ بلکہ مینخی اپنی اس تحریر کے آگے چل کر لکھتا ہے کہ بادشاہ کے دربار میں ایسی مجلسیں لگتی رہیں اورنگ زیب کے دربار کا نہایت معتبر مؤرخ بختاور خاں جس نے اورنگ زیب کے تقویٰ کا خوب نقشہ کھینچا ہے اپنی کتاب "مرآۃ عالم" میں لکھتا ہے :-

"سن شعور کو پہنچتے ہی وہ ہمیشہ ممنوعہ لہو اور عادات سے دور رہا۔ اور اپنی نہایت شرافت سے کچھ اختیار نہیں کیا۔ مگر جو طیب اور مطابق شرع ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے پایہ تخت کے تحت ان لوگوں کا مجمع جمع کر دیا ہے جو برائی کی مجلس نشاط و طرب کی طرف گویوں کی شکل میں رغبت کرتے ہیں۔ جن کے خوش گلو گانے اور عمدہ ساز کے فن کو وہ ابتدار جلوس میں کبھی کبھی سنتا رہا ہے۔ اور پھر وہ گانے کو خوب سمجھتا ہے۔ مگر اب کئی سال گزر چکے ہیں کہ بوجہ زہد و تقویٰ امام شافعیؒ کی تقلید میں وہ بالکل ہی اس نشاط و طرب سے اعراض کرتا ہے۔ اگر کوئی گویا یا ماہر موسیقی اپنے پیشہ سے شرمسار ہوتا ہے تو وہ اس کو وظیفہ دیتا ہے۔ یا اس کے گذارہ کے لئے اراضی دیدیتا ہے۔"

اب اس تحریر مرآت سے صاف واضح ہے کہ اس نے کبھی کوئی ایسا حکم صادر نہیں کیا سوا اس کے کہ اس کا اپنا ذاتی رویہ ایسے فنون کی حوصلہ افزائی کے لئے ضرور سد راہ کہا جا سکتا ہے۔ اس تحریر سے ایک اور ضروری امر کی طرف خیال جاتا ہے۔ کہ ممکن ہے لوگ اس قدر اس طرف متوجہ ہو گئے ہوں کہ

اسے ان کے غلو سے دیگر امور سلطنت جو فرائض بادشاہی میں شامل ہے یعنی فرائض راعی و رعیت کی رعایت میں خطرہ پیدا ہوگیا ہو۔ جس کی وجہ سے اس نے توجہ کو پھیر لیا ہو۔ ایک بادشاہ کے لئے ہزارہا فرائض ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ جن کے لئے مختلف انتظام اور احکام اختیار کئے جاتے ہیں۔

منجی سے بڑھ کر ایک اور اس دور کے ہندو مورخ[1] نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے حکم سے شعراء و گانے والوں کو نکال دیا تھا۔ گانے کے متعلق تو اوپر مفصل آچکا ہے مگر ان کی تسلی کیلئے شاعری کے سلسلہ میں عرض ہے اگرچہ یہ موضوع خالصاً علم ادب کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے مگر تاہم اتنا کہنا کافی ہوگا۔ کہ شعراء کے سلسلہ میں یہ ہرگز بے بنیاد ہے بلکہ اس کی تکذیب میں برنیر نے خود اپنے سیاحت نامہ میں ایک ایک عظیم الشان مشاعرہ کا ذکر کیا ہے جو کشمیر میں ہوا جیسا کہ الفاظ ذیل سے ظاہر ہے:۔

"ایک مشاعرہ جو بڑے جوش و خروش کے ساتھ شعرائے کشمیر اور بادشاہی شاعروں کے باہم ہوا تھا، میں نے بڑے شوق سے اسے دیکھا تھا۔ یعنے ہمارے کشمیر پہنچتے ہی اورنگ زیب کے حضور میں شعراء مذکور نے کشمیر کی تعریف و توصیف میں قصائد پیش کئے جن کو بادشاہ نے قبول فرما کر بہت مہربانی سے مناسب صلے عطا فرمائے۔ ان قصائد میں حد سے بڑھ کر غلو اور مبالغے کئے گئے تھے اور مجھ کو یاد ہے کہ ایک شاعر نے کشمیر کے گرداگرد کے پہاڑوں کی بابت یوں بیان کیا تھا۔

پھر اس کے بعد برنیر شاعر کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر اس اس طرح اشعار کہتا تو کشمیر کی تشبیہ باغ عدن سے ہو سکتی تھی وغیرہ وغیرہ[2]

برنیر سیاح نے اپنے سفر نامہ میں ایک مشاعرہ بعہد اورنگ زیب کا ذکر کیا ہے جو اس کے سامنے کشمیر میں ہوا۔

[1] سلم اول ان انتریا از ایشوری پرشاد ص [2] وقائع سیر و سیاحت، ڈاکٹر برنیر ترجمہ اردو مراد آباد ۱۸۸۸ء جلد دوم

شائستہ خاں آپ سے ملنے آتا ہے تو الفاظ ذیل سے اظہار مسرت کرتا ہے ؎

.... رسیدہ ظہور کیفیت رہ نوردی و مرحلہ پیمائی آں محمدہ خواتین زمان موجب مسرت وبہجت بے پایاں گردید بمقتضائے فرط اشتیاق زبان حال بدیں مقال مترنم نمود ؎ با مژدہ گر ازدرم در آئی چہ شود تا تاختہ پیش از خبر آئی چہ شود ۔
زدہ آخدمت نظر بشوقم دیراست از روز اگر زود تر آئی چہ شود ۔

جنگِ فیلاں

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ تیموری شہزادے ابتدا سے ہی بہادرانہ جنگجو زندگی گذارنے کے باوجود ویسے ہی کھیل کود میں بھی سب سے آگے تھے ۔ جیسا کہ ان کے عہد کی تحریریں اور قدیم تصاویر شاہد ہیں ۔ مثلاً چوگان بازی ۔ شکار ۔ جنگ فیلاں وغیرہ وغیرہ ۔ بلکہ یورپ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ بہت سے ایسے کھیل مشرق سے مغرب میں آئے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہجہاں والد اورنگزیب کو جنگ فیلاں کا بیحد شوق تھا ۔ اکثر ان کی جنگیں کرا کر حظ اُٹھایا کرتا تھا ۔ اور ایسے موقعوں پر شہزادے بھی ہمراہ ہوا کرتے تھے بلکہ باقاعدہ کھیل میں حصہ لیا کرتے تھے ۔ اورنگ زیب کو ابتدا سے ہی ایسے بہادرانہ کھیلوں سے شغف تھا ۔

ایسی جنگوں کا ذکر بہت جگہ ملتا ہے ۔ مؤرخین اورنگ زیب نے ایسے واقعات کو بہت سے مقام پر تعین کیا ہے ۔ حمید الدین نیچہ اپنے احکام میں بیان کرتا ہے کہ بادشاہ شاہجہاں لاہور کے باغ میں جنگ فیلاں کا مشاہدہ کر رہے تھے ۔ ایک دفعہ آپ کو صوبہ دار بنگالہ نے بہت عمدہ جنگجو ہاتھی ارسال کئے ۔ بادشاہ جھروکہ میں بیٹھا حظ اُٹھا رہا تھا ۔ ایک ہاتھی اپنے حریف سے بھاگ کر شاہزادوں کی طرف آیا ۔ تینوں شہزادے چپ و راست بھاگے مگر اورنگ زیب جس کی عمر ۱۴ سال

کی تھی اپنی جگہ پر جما رہا اور ہرگز حرکت نہ کی۔ تا آنکہ یہ ہاتھی آپ سے گزرا۔ جونہی کہ ہاتھی شہزادے کے پیچھے سے اپنے حریف سے بھاگنے میں مصروف تھا۔ آپ نے اپنے نیزے سے جو آپ کے ہاتھ میں تھا حملہ کیا۔ ہاتھی نے اپنی سونڈ سے گھوڑے کو زمین پر گرا دیا۔ اورنگ زیب نے فوراً لپک کر دوبارہ نیزے کے دستہ کو پکڑ کر حملہ کیا۔ تاکہ ہاتھی کے سر پر مارے۔ یہ ماجرا دیکھ کر لوگ دوڑے۔ شاہجہاں بوجہ اضطراب جھروکہ سے نیچے آگیا۔ اورنگ زیب آہستہ سے بادشاہ کی طرف ہولیا ——

اعتماد خاں ناظر جو بوجہ آصف خاں کے جداور سے تعلق رکھتا تھا نزدیک آیا اور باآواز بلند کہا۔ "تم آہستہ چلے آرہے ہو حالانکہ بادشاہ عجب حال میں ہیں"۔ آہستہ سے جواب دیا "اگر ہاتھی یہاں ہوتا تو میں جلدی کرتا۔ اب اضطراب کیسا"۔ بعد میں جب اورنگ زیب والد کے قریب آیا تو ایک لاکھ روپیہ شہزادے پر نثار کے لئے فرمایا۔ اور کہا "میرے بچے اللہ کا شکر ہے کہ یہ معاملہ خیریت سے تمام ہوا۔ اگر خدانخواستہ صورت دیگر ہوتی تو کیسی رسوائی ہوتی"۔ تسلیم بجالایا اور عرض کی "اگر صورت دیگر ہوتی تو رسوائی نہ ہوتی۔ رسوائی تو اس میں ہے جو میرے بھائیوں نے کیا ؎

پردہ پوش بادشاہ مرگ است
دریں چہ رسوائی —— است[1]"۔

بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری میں اس طرح ہے کہ بادشاہ شاہجہاں ۲۹ ذیقعدہ ۱۰۴۲ھ کی صبح کو جنگ فیلاں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دو بدمست ہاتھی سدھکر اور صورت سندر (آگرہ میں) دریا کے کنارے چھوڑے گئے۔ اور بادشاہ خود جھروکہ میں بیٹھا حظ اُٹھا رہا تھا۔ تینوں شہزادے دارا۔ شجاع۔ اورنگ زیب اپنے اپنے گھوڑوں پر یہ سب ماجرا مشاہدہ کر

[1] احکام عالمگیری۔ حکم اول

رہے تھے۔ صورت سندر بھاگا اور سدھکر نے اپنے مدمقابل کا تعاقب کیا۔ اور مجمع کی طرف بڑھا اتفاق سے اُدھر ہی اورنگ زیب تھا۔ اس نے بھاگتے ہوئے ہاتھی کی پیشانی کو اپنے نیزے سے زخمی کیا۔ ہاتھی مزید غضب ناک ہوکر اورنگ زیب پر حملہ آور ہوا۔ آتشبازی چھوڑی گئی۔ (چرخی اور بان) مگر بدمست ہاتھی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اورنگ زیب کے گھوڑے کو سونڈ سے گرادیا۔ لوگ پریشان ہوئے مگر اورنگ زیب نہایت دل جمعی سے کھڑا ہوگیا تلوار ہاتھ میں لے لی۔ شجاع نے خلقت کو چیر کر ہاتھی پر اپنا نیزہ مارا مگر اس کے گھوڑے کے ہاتھے پر ایک چرخی ایسی آکر لگی کہ اس نے پیچھے ہٹ کر اس کو گرادیا۔ جے سنگھ نے بھی نیزہ سے حملہ کیا مگر اس کا گھوڑا بھی خوف زدہ ہوا۔ اسی اثنا میں صورت سندر نے لوٹ کر مقابلہ کیا۔ اور ادھر سدھکر ہجوم و آتشبازی سے تنگ آچکا تھا۔ بھاگ نکلا۔ اس وقت اورنگ زیب کی عمر ۲۴ سال کی تھی۔ شاہجہاں نے اس کی بہادری سے متاثر ہوکر شہزادہ اورنگ زیب کو آغوش شفقت میں لے لیا۔ اس کو پنج ہزاری اشرفی سدھکر ہاتھی۔ و دیگر انعامات و اکرامات جو دو لاکھ روپیہ پر مشتمل تھے۔ اس کے تین روز بعد جمعہ کے دن دوم ذی الحجہ ۱۰۴۳ھ اورنگ زیب کی ۱۵ ویں سالگرہ کے روز عطا کئے۔

اسی طرح دیگر مؤرخین و شعراء دربار نے بھی اس واقعہ کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ذیل میں طالب کلیم کے اشعار کو درج کیا جاتا ہے۔

در تعریف رزم آوری شاہ اورنگ زیب بافیل

اختصار از بادشاہ نامہ کلیم ابو طالب

حدیثی سراسر بیان وقوع　　بگویم بتو از زبان وقوع

ملا بادشاہ نامہ عبدالحمید ص ۹۳-۹۲-۴۸۹/۱

حدیثی در و پیر بر نا یکی — بنقش زبان قلمها یکی
خوارند این قصه هنگامه را — شمارند افسانه شاهنامه را
کهی از نظر فوج لشکر گذشت — کهی کوه پیکر لکاور گذشت
بفیلان جنگی چو نوبت رسید — دران عرصه آمد قیامت پدید
که شهزادهای سپهر احتشام — برآیند بر توسن خوش خرام
ز قصر شرف سوی میدان روند — بنظارهٔ جنگ فیلان روند
گرفتند تعلیم از فیل مست — بفوج غنیمان فگندن شکست
مبادا که شهزادهای دلیر — شمارند فیلان جنگی حقیر
بنوی دیگر فیل این عرصه راند — که از دهشتش عقلها مات ماند
دوید از قضا راند و فیل مهیب — یکی سوی شهزاده اورنگ زیب
صف چاره حلق و رهم درید — بشهزاده شیر صولت رسید
یکی نیزه برق سان تافته — نظر از رگ غیرتش یافته
ز بس نیزه در کله اش شد نهان — سرش گشت فانوس شمع زبان
ازان رفته کر نیزه شد در سرش — برون رفت مستی مد در سرش
دران کوه پیکر نهان شد سنان — دگر باره در رفت آهن بکان
گرفت شهزاده از وی سوار — ز بیم آب شد زهره روزگار
بدید آتش شهزاده کامیاب — مقابل چو با صبحدم آفتاب
علم کرد شمشیر و بر وی دوید — کزان سوی فیل غنیمش رسید

منقول از خطوط مملوکه دفتر دیوانی باجازت قبله سید خورشید علی ناظم محکمه هذا - حیدرآباد دکن

در آغاز و انجام ایں کردوار	ہمی دید شاہنشہ کامگار
سر آں را ز عزت بگردوں سلند	بروصل حالا جواہر فشاند
نظر کردہ شاہ آفاق شد	بمردانگی در جہاں طاق شد
ہمیشہ براورنگ فرماندہی	بماناد با فر ظل الٰہی
از ینجا زشہزادہ کامراں	مسخر کند چار رکن جہاں

متذکرہ بالا بیانات تو محض اورنگ زیب کے اوائل زمانہ شاہزادگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اوران سے یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ یہ جنگ فیلاں کس طرح ترتیب دیا جاتا تھا۔ تاکہ یہ پوری طرح سمجھ میں آجائے۔ ہمیں سیاح برنیر کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس نے اپنے سیاحت نامہ میں اپنے مشاہدات اس ضمن میں قلمبند کئے ہیں جو دراصل اوّل زمانہ شاہنشاہت عالمگیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن سپاہگری ابھی تک اپنی پوری روایات سے قائم تھے۔ اور یہ تمام ساز و سامان دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ شاہی حرم بھی اس سے حظ اٹھاتا تھا۔ جس طرح آں حضرت صلعم کے زمانہ میں حرم محترم ایسے بہادرانہ کھیل آپ کے دوش بدوش ملاحظہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ برنیر صاحب لکھتا ہے:۔

"جشن کا اختتام ایک ایسے تماشے پر ہوتا ہے جس سے یورپ میں کوئی بھی واقف نہیں یعنی ہاتھیوں کی لڑائی جو عام خلقت کے سامنے جمنا کی ریتی میں لڑائے جاتے ہیں اور بادشاہ اور بیگمات اور تمام امراء قلعہ کے جھروکوں میں سے تماشا دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک خام دیوار تین یا چار فٹ چوڑی اور پانچ فٹ اونچی بنائی جاتی ہے۔ اور اس کے دونوں جانب سے دو قوی ہیکل ہاتھی جن پر دو آدمی سوار ہوتے ہیں مقابل کئے جاتے ہیں۔ دوسرا آدمی اس لئے ہوتا ہے کہ اگر ہاتھی کی گردن پر سے ایک گر پڑے تو دوسرا آنکس سے اس کو چلائے۔ اور یہ لوگ کبھی تو ان کو بڑھاوا

دیکر اور کبھی بُرا بھلا کہہ کر اور پاؤں سے ہول کر آگے بڑھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بیچارے جانور دیوار کے پاس پہنچ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں اور ایسی ٹکر لگاتے ہیں کہ دیکھ کر خوف آتا ہے۔ اور سر اور سونڈ اور دانتوں کے زخموں سے ان کا زندہ رہنا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑائی اکثر رہ رہ کر ہوتی ہے۔ آخر کار مٹی کی دیوار گر جاتی ہے اور زبردست اور دلیر ہاتھی اس کو پھاند کر حریف پر حملہ کرتا اور اس کو بھگا دیتا ہے۔ اور ایسا پچھیا دباتا ہے کہ آتشبازی کی چرخیوں کے بغیر جوان کے بیچ میں چھوڑ دی جاتی ہیں حریف سے الگ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جانور بالطبع ڈرپوک ہے اور خصوصاً آگ سے بہت ڈرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ جب سے آتشیں ہتھیار لڑائی میں برتے جانے لگے ہیں ہاتھی لڑائی میں بہت کم کارآمدہ گئے ہیں۔ اور اگرچہ سراندیپ کے ہاتھی سب سے زیادہ دلیر ہوتے ہیں مگر خواہ کہیں کے ہوں میدان جنگ میں لے جانے سے پہلے لڑنے تک ڈر کھونے کے لئے ان کے کانوں کے پاس بندوقیں اور ٹانگوں میں پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔

ان عظیم الشان جانوروں کی لڑائی کا خاتمہ بڑی بے دردی پر ہوتا ہے۔ یعنی اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہاتھی اپنے حریف کے مہاوت کو اپنی سونڈ سے پکڑ کر نیچے گرا لیتا ہے اور فوراً پاؤں سے کچل ڈالتا ہے۔ اور مہاوتوں کا کام ایسا خطرناک ہے کہ یہ بدنصیب آدمی اپنے جورو بچوں سے اس طرح سے رخصت ہوتے ہیں کہ گویا مرنے کو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے دل کو اس خیال سے کسی قدر تسلی رہتی ہے کہ اگر زندہ بچے اور بادشاہ ان کی کارگذاری سے راضی ہوا تو نہ صرف ان کی تنخواہ بڑھ جائے گی۔ بلکہ ہاتھی سے اترتے ہی پچیس روپیہ کے پیسوں کی ایک تھیلی مل جائے گی۔ اور اگر کام آگئے تو ان کی تنخواہ ان کی بیوی کو ملتی رہے گی۔ اور بیٹا اس کی جگہ نوکر ہو جائے گا۔ اس تماشے میں مہاوتوں ہی کی جان نہیں جاتی بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غصے میں بھرے ہوئے

جانوروں سے بچنے کے لئے ایسی سخت بھاگ پڑتی ہے کہ پیدل اور سوار اس طرح پر بھاگتے ہیں کہ بعض آدمی گر کر لوگوں یا خود ہاتھیوں کے پاؤں سے کچل جاتے ہیں۔ چنانچہ دوسری بار مجھ کو اس تماشے کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو صرف اپنے گھوڑے کی خوبی اور دو خدمتگاروں کی کوشش کی بدولت بچا تھا۔

آلاتِ حرب

چونکہ اورنگ زیب بحیثیت سپاہی بہ نسبت شاہنشاہ کے زیادہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس کی تمام زندگی از مہد تا لحد سراسر فن سپاہگری ہی نظر آتی ہے اور اب بھی جب اس کا ذہن میں تصور آتا ہے جس طرح جہانگیر کا کشمیر کی سیر میں مصروف اور شاہجہاں کا تاج محل آگرہ کی تعمیر کا ملاحظہ کرتے۔ ان کی زندگی کی تصویریں ذہن میں آتی ہیں۔ اسی طرح اورنگ زیب کا تصوّر یہ آتا ہے کہ گولکنڈہ یا بیجاپور کے محاصرہ پر یا اجین اور آگرہ کے کسی میدان میں برسرِ جنگ کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ اس کے زمانہ کا سامانِ حرب ایک امتیازی صورت رکھتا ہے۔ آپ دکن تمام قلعوں کی سیر کیجئے وہاں جو چیز سب سے پہلے مشاہدہ میں آئے گی وہ توپوں کے گولے اور توپیں ملیں گی۔ پھر ان کا بغور مطالعہ کریں گے تو ان پر غازی اورنگ زیب کا اسم گرامی وغیرہ کندہ نظر آئے گا۔ میں نے ایسے سامان کو بہت جگہ دیکھا۔ محض نمونہ کی غرض سے چند ایک پیش کرتا ہوں۔

قلعہ دولت آباد میں ایک توپ ہے جس پر ذیل کی عبارت کندہ ہے:۔

سفرنامہ ترجمہ اردو جلد دوم ص ۲۹۴-۲۹۵

دنبالہ پر:۔ عمل محمد حسین عرب ۔ کمر پر:۔ قلعہ شکن ۔ پیشانی پر:۔ ابوالمظفر محمد محی الدین اورنگ زیب عالمگیر شاہ غازی ۔ دہانہ پر:۔ "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ"

قلعہ گولکنڈہ میں ایک توپ پر:۔

کلہ یک من بارود سیزدہ اثار پاؤ بالا ۔ عمل محمد حسین عرب ۔ توپ فتح رہبر جلوس ہمایوں سنہ ۱۶ مطابق سنہ ۱۰۸۳ھ مقدس ۔ ابوالمظفر محمد محی الدین اورنگ زیب بہادر بادشاہ غازی ۔

اور توپ اسلام نگر میں جو شہر بھوپال سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے وہاں برج پر دھری ہے اس پر کندہ ہے:۔

"کلہ ہشت آثار ۔ دارو دو اثار سی درم بوزن شاہجہانی توپ فتح جنگ سنہ ۱۰۹۶ھ بادشاہ غازی محمد اورنگ زیب بہادر ۔ باہتمام شجاعت شعار ذوالفقار خاں ۔ عمل محمد حسین عرب"

یہ مخفی نہ رہے کہ محمد حسین عرب سرکار عالمگیری میں بہت بڑا کامل استاد توپ ڈھالنے والا تھا اس کے ہاتھ کی ڈھلی ہوئی توپیں قلعہ اسیرگڑھ خاندیش ۔ احمد نگر ۔ دکن ۔ قلعہ بیدر وغیرہ میں بہت دیکھنے میں آتی ہیں۔

چونکہ ایسے سامان کو نیست و نابود ہونے کے لئے بھی قدرے وقت چاہیئے اس لئے عام طور دیکھنے میں آجاتا ہے۔ اگر مزید تلاش کی جائے تو دیگر سامان حرب مثلاً تواریں ۔ قبضے کٹار وغیرہ ابھی عجائب خانوں میں یا امراء کے گھروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ مجھے ایک مرتبہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب نے ایک خنجر دکھایا تھا۔

ان آلات کے دیکھنے سے یہ ضرور واضح ہوگا کہ اورنگ زیب نے ایک امتیازی شان پیدا کی تھی ۔ جو ہمہ تن اس کے اعلیٰ معیار فن سپاہگری پر دال ہے ۔ جو دیگر شاہنشاہوں کے عہد میں کم ملتی ہیں چونکہ اورنگ زیب کا زمانہ بادشاہی کا بیشتر حصہ حیدرآباد میں گزرا اس لئے یہ سامان زیادہ یہیں دیکھنے میں آتا ہے۔

بیجاپور میں میں نے ایک بہت بڑی توپ ملک میدان کے نام سے دیکھی۔ میرے خیال میں غالباً یہی توپ دنیا بھر کی توپوں میں بڑی ہو سکتی ہے۔ اس کے منہ میں ایک آدمی اکڑوں ہو کر آسانی بیٹھ سکتا ہے اور یہ قلعہ کی فصیل پر پڑی ہے۔ اس پر ذیل کے کتبات ہیں:۔

اللہ ولا سواہ

خادم اہل بیت اسد اللہ ابو الغازی نظام شاہ ۱۱۰۸ھ

شاہ عالمگیر بادشاہ دین پناہ — فتح بیجاپور کرد و بہر تاریخ ظفر
آنکہ داد عدل داد و ملک گرفت — وعدۂ اقبال گفتا ملک میداں را گرفت

عمل محمد حسین رومی۔"

خنجر وغیرہ کے متعلق اپنے لڑکے کو ایک خط میں یوں لکھتا ہے۔ میرے نسخہ کلمات طیبات میں ہے:۔

"بفرزند عالیجاہ بنویسید کہ در بنولای در خنجر ہائے انعامے خنجرے از اموال خان جہاں مرحوم برآمد چوں نفائستے و ندرتے داشت باکل سلیمانی استعمال سرکار فرستادہ شد دریں ضمن یک کرسی خاتم بندی کہ کار کشمیر بے نظیر است۔ میگو پنداز کچکولہ پیش کش آوردہ بودند نیزہ خنجر عنایت شد

دوستاں را کجا کنی محروم — تو کہ با دشمناں نظر داری"

احکام میں ایک ہی تحریر ملتی ہے کہ سید حسن علی خاں جس نے ہنومنت کے ساتھ لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ ان دونوں سید حسن علی خاں اور حسین علی خاں جن کو تاریخ ہند میں بادشاہ گر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کی حسن کارکردگی کی وجہ سے ہشت صدی سے ہزاری اور ہفت صدی سے نہ صدی کے اضافہ کی ذوالفقار خاں بہادر نصرت جنگ نے سفارش کی۔ مگر جب یہ حکم بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو آپ نے اس کی پشت پر تحریر کیا ان سید بھائیوں کو جو باعث اعانت ہیں ان کو اس کی بجائے

خنجرہ مرصع وغیرہ ارسال کئے جائیں۔ جو الفاظ ذیل سے عیاں ہے جس سے میانان آلات کا پتہ چلتا ہے:۔

" آفریں چرا نباشد! سادات منبع السعادات ہمیں معنی دارند کہ در اعانت دین متین جد خود حضرت سید المرسلین از جان کوشش نمایند۔ برائے ہر دو بہادر دو خلعت از توشک خانہ خاص با دو خنجر شمشیر سادہ بعلاقہ مروارید بدست گرز بردار بفرستند۔ وحمیدہ الملک حسب الحکم تحسین و آفرین فراواں نوشتہ ارسال دارد۔ برعرض دستخط شد کہ تجویز اضافہ از آں خانہ زاد مزاجداں بسیار مرفع شد۔ عدم استمالت ارباب سیف از سرواراں حیف است نشود۔ لیکن قبول اضافہ یک دفعہ مشکل "

دہلی میں ایک نمایش ۱۹۱۱ء میں ہوئی جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اس میں بعض آلات اورنگ زیب کے عہد کے آئے۔ فہرست ۸۱۷۵ ایک ظفر تکیہ جس پر سونے کا جڑاؤ کام ہے۔ ظفر تکیہ کا اصل استعمال یہ ہے کہ بادشاہ اپنی مسند پر یا دیوان کے قریب رکھتا تھا۔ اس کے دستہ کی شکل ایسی ہوتی تھی کہ اس پر بازو رکھا جا سکے۔ اس پر ذیل کے الفاظ سونے میں ملتے ہیں ؎

(ایں) ظفر تکیہ کہ با فتح و بہبود است مشرف از قبضۂ اورنگ زیب است

ایک اور تلوار ۱۷۸ ۸ جس پر سونے کا جڑاؤ کام بھی ہے۔ اور اس کا نام جھرے کے عمدہ کام کا ہے۔ اس پر "اسد اللہ اصفہانی" کا نام ملتا ہے۔ دوسری طرف اس کے نستعلیق میں "شاہ عالمگیر ۱۱۱۰ھ بادشاہ" لکھا ہے۔

اس کے آگے پھر ایک تلوار ۱۷۹ ۸ ہے جو سونے کے کام سے مزین ہے۔ اس کے نیام پر "عالمگیر شاہی ۱۱۰۱ھ" لکھا ہے۔ اس کے دوسری طرف ذیل کے اشعار ہیں۔ کچھ فارسی میں ہیں کچھ اردو میں ؎

سر تیغ را چوں بدست آوریم　　بصفحای دشمن شکست آوریم
بشمشیر من فیلہا شد دو نیم　　چو دریائے نیل است عصای کلیم

ذیل کے اردو اشعار بھی ہیں :-

یہ وہ تیغ ہے کھینچئے وقت جنگ　　تو رستم بھی ہو جائے دیکھ اس کو دنگ
اگر دیکھے بجلی بھی اس کی چمک　　تو بے اختیار دے آنکھ کو جھپک

گر یہ اردو اشعار بعد کے ہیں کیونکہ اس تلوار پر صاف

"سرکار نواب منصور علیخاں بہادر ۱۱۷۷ھ"

کندہ ہے۔ جو غالباً نواب صاحب کے قبضہ میں رہ کر یہ اشعار لکھے گئے ہیں۔

دہلی میوزیم میں ایک تلوار عالمگیر کی ہے جس پر "اللہ و علی" کندہ ہے۔ اور اس پر ایک چھتر بحیثیت نشان بادشاہی کے سونے میں کندہ ہے۔ دستہ کے قریب صاف لکھا ہے "عالمگیر بادشاہ غازی ۱۱۱۲ھ" یہ تلوار برن روتھ شیلڈ کے پاس فروخت کی گئی تھی (فہرست ۱۰۷)

رقائم کرام میں ملتا ہے :-

"درینولا در خنجرہای انعامی خنجری از اموال خانجہاں بہادر مرحوم برآمد۔ چوں نفاستی و ندرتی تمام داشت باتسبیح سلیمانی فرستادہ شد و دریں ضمن یک کرسی حاتم بندی کہ کار کشمیر بے نظیر میگویند از کچکرہ پیشکش آوردہ بودند ہم عنایت شد اجلاس میمنت اساس بر دنمایند خدا مبارک کناد"

سکہ جات

یہ ایک بذات خود فن ہے اور ابتدائے اسلام سے لیکر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس میں

بہت عجیب و غریب اختراع وقتی اعتبار سے کیں اور اس کو ایک خاص فن شمار کیا۔ چونکہ اوائل اسلام میں جو سکے مسلمان خلفاء کے مشاہدہ میں آئے وہ ساسانی تھے جن پر تصاویر بھی تھیں تو خلیفہ ولید نے انہی سکوں پر ایک طرف کچھ عربی میں تحریر کر دی جو بسم اللہ سکہ جات کے نام سے مشہور ہیں۔ چونکہ اسلام میں تصویر ممنوع ہے اس لئے مسلمانوں نے بعد میں نہایت خوبی سے خط طغرا۔ کوفی۔ نسخ۔ تعلیق و نستعلیق وغیرہ میں ان کی رو سے اپنے اپنے دور کو نمایاں کیا۔ جو اس وقت ہر دور۔ ہر سلطنت کے لئے خاص متمیز ہیں۔ بعض مغلوں کے زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہانگیر نے پھر تصاویر کا اعادہ کیا مگر فوراً ہی ختم ہو گیا۔ اورنگ زیب کا عہد اس ضمن میں بحیثیت فن اور سیاسیات دونوں پہلو رکھتا ہے۔

۱۶۵۸ء میں جو حصول تخت نشینی کا جنگ اول اول داراکی طرف سے شروع ہوا جسے جنگ سیاسی کہنا بے جا نہیں ہوگا جب کہ دارا ایک حیثیت سے کلی طور پر سلطنت کے امور کے سیاہ سفید کا مالک ہو چکا تھا۔ مگر اسے یہ جرأت نہ تھی کہ وہ اپنے نام کا سکہ ضرب کراتا۔ جیسا کہ شجاع اور مراد نے بغیر فیصلہ ہوئے دیگر بھائیوں اور والد کی موجودگی میں کیا۔ اور ان کے سکے ملتے ہیں۔

۱۔ شجاع کے سکہ پر ذیل کی عبارت ملتی ہے :۔

"سکندر ثانی محمد شجاع احمد شاہ بہادر غازی۔ بصدق ابی بکرؓ و عدل عمرؓ"

اور اس پر ضرب اکبر نگر ہے۔

۲۔ مراد کے سکہ پر ذیل کی عبارت ملتی ہے جو ایک شعر ہے ؎

گرفت ارث صاحبقران شاہجہاں　　مراد بخش شہ محمد سکندر ثانی

اس کے سکوں پر دار الضرب سورت۔ کھنبائت۔ احمد آباد ملتے ہیں۔

عالمگیر ایسی سب باتوں سے بہت متاثر تھا۔ مگر ایسی بے وقوفی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا

جب اس نے اپنی حکمت عملی اور بہادری سے مطلع صاف کر دیا اور اس کو کسی حد تک اطمینان ہو گیا تو وہ دہلی کے قریب اغرا باد شالامار باغ میں آیا۔ جہاں تاجپوشی کی رسم منائی گئی اور اس کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ مستعد خاں مآثر عالمگیری میں لکھتا ہے کہ

"اول شاہان مغلیہ کے سکوں پر کلمہ طیبہ اور اصحاب اربعہ کے اسماء ہوتے تھے۔ مگر اورنگ زیب نے ان کو خلاف ادب سمجھ کر خط نستعلیق میں محض ذیل کا شعر جسے میر عبدالباقی صہبائی نے موزوں کیا تھا اور سکہ کے دوسری طرف سنہ وضرب کندہ تھا۔

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر　　شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور ایک طرف دارالضرب وسن جلوس وغیرہ ہوتا تھا۔ ان سے عالمگیر کی سلطنت کی وسعت کا پتہ چل سکتا ہے۔ کہ اس سے قبل کسی شہنشاہ ہند کو اتنی بڑی سلطنت حاصل نہیں ہوئی۔ اور نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے جنوب ہند میں پولیگار کا حصہ اس کے قبضہ میں تھا۔ مگر یہ بھی باجگزار ضرور تھا۔ چاندی کے سکوں پر لفظ بدر بجائے منیر کے ہوتا تھا۔

بعض خاص خاص سکوں کا ذکر کتب و مجامیع میں ملتا ہے جو بہت ہی حیرت انگیز ہیں۔ جیسا کہ مہاراجہ سندھیا کے توشہ خانہ میں اورنگ زیب کی ایک صد مہر موجود ہے۔ جو جلوس کے پندرھویں سال ۱۰۸۳ھ میں بمقام شاہجہاں آباد مضروب ہوئی تھی۔ اس کا وزن ۲۵ اونس ہے اور اس پر خط نستعلیق میں حسب ذیل عبارت کندہ ہے[1]:-

رخ اوّل:- ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی ۱۰۸۳ھ

اندرونی مربع میں:-

اس کے اطراف میں محیط پر ؎

[1] تاج رسالہ ۱، روئداد بنگال ایشیاٹک سوسائٹی بابت مارچ ۱۸۸۵ء

شاہ اورنگ زیب عالمگیر　　آسماں قدرت و قضا تدبیر
روی دراز فروغ سکہ او　　گشت روشن چو مہر منیر

رخ دوم اندرونی مربع میں:-

"سنہ ۱۵ جلوس میمنت مانوس ضرب دار الخلافہ شاہجہاں آباد"

اس کے اطراف میں محیط پر ؎

شاہ عالمگیر دریائے کرم اورنگزیب　　آنکہ از قسمت بخانش آب میگردد سحاب
از فروغ سکہ اش در عرصہ ہندوستاں　　گشت روشن زرچو سیمای ماہ آفتاب

اسی نقش اور اسی وزن کی ایک صد مہر اشرفی کو جنرل کننگھم نے ۱۸۸۱ء میں بمقام بنارس دیکھا تھا۔ اسی نقش کا ایک نقرئی سکہ ورسٹن کے عجائب خانہ میں بھی ہے جس کا وزن غیر معمولی ہے جو ۱۰۸۵ھ کی مضروب شاہجہاں آباد ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے خزانہ میں سونے چاندی کے بے شمار سکے جمع کئے تھے۔ اور اس ذخیرہ کو سرقہ سے بچانے کی غرض سے ان کو گلا کر بہت وزنی اور بڑے سکوں کی صورت میں مضروب کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بڑے اور وزنی سکے آجکل کے کرنسی نوٹوں کا کام دیتے تھے۔

اسی طرح اورنگ زیب نے اپنے عہد کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ان میں چند مزید خصوصیات بھی پیدا کیں جو اس سے قبل کسی کے عہد میں نظر نہیں آتیں۔ چنانچہ اس نے ۱۶۷۹ء ۱۰۸۹ھ میں غیر مسلموں پر جزیہ کا اجرا کیا۔ اور اس کی ادائیگی کی سہولت کو مدنظر رکھ کر اس نے "شرعی درہم" کے نام سے نقرئی سکے مضروب کئے جو عام طور پر مربع شکل کے تھے۔ مگر یہی شرعی درہم فرخ سیر نے پھر جاری کیا جب اس نے پھر جزیہ کا اجرا کیا۔

اورنگ زیب نے سنہ جلوس میں بوجہ کمی تانبہ کے فلوس کا وزن کم کر دیا جو خاص کر جنوبی

ہند میں عمل میں آیا۔ مگر عام طور پر مغلوں کا سکہ تانبہ (فلوس) شیر شاہ کے دام کے طریق پر تھا۔ جو وزن کے اعتبار سے اورنگ زیب کے عہد تک انہیں روایات پر رہا۔

اورنگ زیب کی فتوحات جنوبی ہند نے نقرئی دار الضرب کی تعداد ستر تک بڑھا دی تھی۔ اور تانبے کے چوبیس۔

عہد عالمگیر کے نئے دار الضرب

ذیل کی چند نئی ٹکسالیں اورنگ زیب کے عہد میں علاوہ قبل کے قائم ہوئیں جن سے صاف واضح ہے کہ اس کے عہد میں سلطنت مغلیہ کس قدر وسعت پر تھی۔

احسن آباد۔ اودنی۔ اسلام آباد۔ اسلام بندر۔ اعظم نگر۔ امتیاز گڈھ۔ اورنگ آباد (خجستہ بنیاد) بریلی۔ لنکاپور۔ بیجاپور۔ پونچ۔ تورگل۔ جنجی۔ چنیاپٹن۔ حیدر آباد۔ خیر نگر۔ رتنمبور۔ ستارہ۔ شولاپور۔ ظفر پور۔ عالمگیر پور۔ عظیم آباد۔ کرپا۔ کریم آباد۔ گلبرگہ۔ گوتی۔ مچھلی پٹن۔ محمد آباد محمود بندر۔ مخصوص آباد۔ مراد آباد۔ مرشد آباد۔ معظم آباد۔ ملکا نگر۔ میلاپور۔ نصرت آباد۔

بعض دار الضرب کے نام اورنگ زیب نے ان کے خواص کے مطابق رکھے۔

بلدہ فاخرہ برائے برہانپور۔

بندر مبارک برائے سورت کیونکہ یہاں سے حاجی لوگ حج کے لئے جاتے تھے۔

دار الامان برائے ملتان۔

دار الجہاد برائے حیدر آباد۔

دار الخیر برائے اجمیر

دار الظفر برائے بیجاپور (دار السرور)

دار الفتح برائے اجین
دار الملک برائے کابل
مستقر الخلافۃ = اکبر آباد۔
خجستہ بنیاد برائے اورنگ آباد۔
دار البرکۃ برائے پٹنہ۔

ان ناموں کے وضع کرنے سے کم سے کم یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر جدت خاص تھی اور وہ ہر وقت اپنے لئے نئی چیز وضع کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کو فنی اعتبار سے خوب مہارت تھی۔ اور اس کی دور اندیشی پر دال ہے۔ پھر وہ پرانی روایات کا مقید بھی نظر نہیں آتا۔ جو بین دلیل ہے کہ تمام حالات پر وہ کس قدر حاوی تھا۔

چینی کوزہ گری

عجائب خانہ برطانیہ کی گائیڈ شعبہ ہذا میں ایک چینی کی پلیٹ کا فوٹو دیا ہے۔ جس کے متعلق گائیڈ نگار محقق کا بیان ہے کہ ایسی طرز کے طباق ہند اور ایران میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تجارتی مقاصد کے لئے سولھویں اور سترھویں صدی میں بنائے گئے۔ یہ خاص طور پر کہاں تیار ہوئیں یہ یقینی نہیں ہے مگر اس کے فٹ نوٹ میں دیا ہے ایک مجموعہ طباق بی بی کے روضہ اورنگ آباد سے برآمد ہوا اس مجموعہ میں بہت سے نمونے اس طرف کے تھے۔ اور بہت سے ٹکڑے بیجاپور میں بھی دستیاب ہوئے۔ مگر گائیڈ نگار نے ایک غلطی کی ہے یعنی بی بی کے مقبرہ کے متعلق لکھتا ہے جو اورنگ زیب

اور شاید اکبر کا تھا۔ مگر یہ یاد رہے کہ عہد اکبر میں اورنگ آباد کا مغلوں کے ہاں خواب بھی نہیں تھا۔ محض مراد بن اکبر اور چاند سلطانہ کے مابین احمد نگر کے متعلق جنگ آرائیاں تھیں۔ یہ نوٹ اس امر پر ضرور روشنی ڈالتا ہے کہ مقابر میں کس قدر شاہی ساز و سامان رہتا تھا۔ اور کس قدر اعلیٰ رہتا تھا۔ اورنگ زیب کے معاملہ میں اس کے لئے ایسی خوبصورت اشیاء کا متحمل اس کی چہیتی بیوی کا روضہ ہی ہو سکتا ہے۔ بلکہ شاہی خانہ داری کے ساز و سامان پر بھی اس سے روشنی پڑتی ہے کہ وہ لوگ اپنے گھروں میں کیا سامان اور کس قسم کا رکھتے تھے۔

میرے کتب خانہ کی کتاب "فرامین عالمگیری" میں ایک تحریر ہے جس میں بہت سے امور کا ذکر ہے جو اہم ہے۔ اس میں منجملہ دیگر امور کے ظروف چینی کا ذکر بھی یوں ملتا ہے: "آفتابہ چینی کہ فغفوری پای تختی است و زیر بسا محرامین خوشنوی سنہ چینی ناشناس برآمدہ بود و ظاہرا از مال غارت شدہ۔ بیجاپور بدست آوردہ بود۔"

کارخانہ جات

متعلق کپڑا

دہلی میں قلعہ معلّٰی اور تخت طاؤس کے تیار ہونے پر جو ۱۰۴۴ھ میں دربار ہوا۔ اس کے لئے زربفت کا شامیانہ ایک لاکھ روپیہ میں تیار ہوا۔ جس کے مخملی سائبان اور طلائی و نقرئی ستونوں کے نقش و نگار احمد آباد کے کاریگروں نے شاہی کارخانہ میں تیار کئے۔ عالمگیر کے عہد دولت میں بھی یہ کارخانہ اچھی حالت میں رہا۔ اور سرکاری فرمائشوں کی تعمیل یہاں سے ہوتی رہی۔ یہاں کے متعلق عالمگیر نے شاہزادہ محمد اعظم کو لکھا ہے جو اس زمانہ میں گورنر تھا:۔

"آں والانسب گرامی حسب در فرمائشہا و تصرفہا سلیقہ درستی دارند و در گجرات کہ زیب و زینت ہندوستان است اہل کسب و ارباب ہنر ہمہ جہت مے باشند۔ بالفعل کارخانہ سرکار

معلّٰی کرازاں جا ..... می آید پر کار و بیش زر و بسیار زرق و برق در دشت و گراں است اگرچہ "کُلُّ شَیئٍ ما خلا اللہ باطل" اما نظر بر کریمہ "یعلمون ما یشاء" کردہ تا اجل مسمّی کار بیکاراں کرد النصیب یصیب در کارخانہ دار الخلافہ شاہجہاں آباد کمخواب و قطنہ خوب می شد۔ الحال موقوف شدہ آں والا گہر ہماں طور بفرمایند در آں جا خوب خواہد شد۔"[1]

اسی طرح برہانپور کے کارخانہ کپڑا کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جہاں متعدد کارخانے تھے اور بعض ان میں سے خاص خاص شہزادوں، شہزادیوں۔ بادشاہ کے لئے مخصوص تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک کارخانہ جہاں آرا اور ایک اورنگ زیب کا اپنا ذاتی تھا۔ لیکن شاہجہاں نے اپنے اور جہاں آرا کے کارخانوں میں اچھے کاریگروں کو مقرر کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب کے کارخانہ میں کام معیار کے مطابق نہیں ہوتا تھا اور دیر میں ہوتا تھا۔ پھر اس نے اس کی شکایت کی اور ملاحظہ کے لئے تمام تیار شدہ کپڑا بھیج دیا۔ جس کے بعد شاہجہاں نے ایک ایسے شخص کو داروغہ کارخانہ اور وقائع نویس بنا کر ارسال کیا جو بد باطن تھا۔ اس قصہ نے بہت طول کھینچا جو خاصی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ گرپارچات کے اعتبار سے وہاں نہایت اچھے اور عمدہ کپڑے تیار ہوتے تھے۔

اسی طرح برنیر نے اپنے سیاحت نامہ میں کشمیر کی شال کا ذکر نہایت خوبصورت الفاظ ذیل میں یوں کیا ہے:۔

"جس نے خاص کر وہاں کی سوداگری کو چمکایا اور کشمیر کو دولت سے مالا مال کر رکھا ہے وہ شال ہے جس کو وہ اپنے کارخانوں میں بناتے ہیں ..... شالیں یہاں دو قسم کی بنتی ہیں۔ ایک کشمیری اون کی جو ملک اسپین کی پشم سے زیادہ نفیس اور ملائم ہوتی ہے۔ دوسری اس پشم

[1] یادایام از مولانا سید عبدالحی صفحہ

کی جس کو توز کہا جاتا ہے اور جس کی ملائمت کو بیور یعنی سگ آبی کی پوستین بھی نہیں پہنچتی اور بڑی تبت میں ایک قسم کی جنگلی بکریوں کی چھاتی پر سے اتاری جاتی ہے۔

کشمیری اون کے ریزے سے توز کی شالیں زیادہ تر عمدہ اور پسندیدہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے ان میں سے چند شالیں دیکھی ہیں جو امراء کے واسطے فرمائشی تیار ہوئی تھیں۔ اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ لاگت آئی تھی اور کشمیری اون کی شال میں نے کبھی پچاس روپیہ سے زیادہ کو فروخت ہوتے نہیں سنی۔"

اس کے بعد کشمیر کی شال کا دیگر ہندوستانی کارخانوں کی شالوں اور کپڑوں سے مقابلہ کرتے ہے

"شال کو اگر کھول کر کئی مرتبہ ہوا نہ دی جائے تو بہت جلد کیڑا لگ جاتا ہے۔ ہر چند پٹنہ آگرہ اور لاہور میں ایسی شالیں بنانے کے واسطے بڑی بڑی کوششیں عمل میں آئیں مگر باوجود ہر طرح کی ہوشیاری کے کشمیری شال کی ملائمت اور بافت کی خوبی نصیب نہ ہوئی اور شاید اس ملک کے پانی ہی کا خاصہ ہے جس کے باعث کشمیری ریزے کو یہ بے نظیر نفاست حاصل ہے۔ چنانچہ مچھلی پٹن کی چھینٹوں وغیرہ کی اعلیٰ رنگت کو بھی جن کو ہاتھ سے چھاپتے ہیں اور جو ہر شوب میں عمدہ ہی نکلتی آتی ہیں وہاں کے پانی کی خاصیت سے منسوب کرتے ہیں۔"[1]

اسی طرح بعض نے دیگر کارخانوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں سے قابل ذکر ڈھاکہ۔ اورنگ آباد کے ہیں۔ اور برنیر نے مچھلی پٹن کی خوبصورت چھینٹ کا ذکر تخت طاؤس کے خیمہ کے سلسلہ میں بھی کیا ہے کہ اس کے باہر سرخ رنگ کا کپڑا تھا۔ اور اندر کی جانب مچھلی پٹن کی نہایت عمدہ چھینٹ تھی۔ جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی اور جس کے بیل بوٹے ایسے قدرتی طور کے اور رنگ ایسے تیز و شاداب تھے کہ ایک تختہ گلزار معلوم ہوتا تھا۔[2]

[1] سفرنامہ برنیر ترجمہ ص ۲۹۲ ج ۲ [2] ایضاً ص ۲۹۳-۲۹۴ ج ۲

کارخانۂ قالین سازی

تاریخ اس قسم کے کارخانجات کی موجودگی پر کم روشنی ڈالتی ہے لیکن بعض خطوں میں ان کا ذکر آجاتا ہے چنانچہ مستقر الخلافۃ اکبرآباد کے قالین خانہ کو ایک وقعہ بطور سند شطرنجیاں (دریاں) کے متعلق لکھا گیا ہے۔ اس میں صاف طور پر ظاہر ہے کہ یک صد و پنجاہ شطرنجیاں جن کی پیمائش دوازدہ گز در ہفت گز مستقر الخلافۃ اکبرآباد میں تیار ہوئی ہیں اور ان کی رسید دی جارہی ہے کہ وہ جنس اول کے موافق وقت مقررہ میں تمام احتیاط میں تیار ہوئی ہیں۔ خرید شدہ مال تحویلدار قالین خانہ سے لیکر ان کی قیمت نوشتہ کے مطابق طلب کر کے ارسال ہوگی۔

کارخانہ جہاز

مغلوں کے عہد میں حاجی لوگ عام طور پر بندر سورت سے حج کے لئے جاتے تھے جہاں ان کی طرف سے بہت سی سرائے آسائش حاجیاں کے لئے موجود تھیں۔ اور اب بھی بعض کے آثار ملتے ہیں۔ اور دیگر مقامات پر بھی اسی طرح ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کو جہازرانی کی طرف بہت خیال تھا اور چاہتا تھا کہ دیگر ممالک اسلامی سے تعارف رہے جس کا ثبوت دیگر غیر ممالک کے سیاحوں کے بیان سے بھی ملتا ہے کہ جب کبھی وہ اورنگ زیب کے سامنے ملاقات کے لئے آئے تو ان سے ممالک اسلامی کے متعلق سوالات کرتا اور ان کی بہبودی وغیرہ سے استفتاء کرتا۔ اور بعض جگہ خط و کتابت کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اور ان کے حالات سے پورے طور پر باخبر رہتا۔ اور اس کے دکن میں ۲۶ سال گذارنے کا اندازہ سوسلی پٹم۔ کوٹلیم۔ دابولی وغیرہ بنا در جاکر ہوتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ عالمگیر رابطہ اسلامی قائم ہوجائے۔ مغلوں

کی طرف سے سورت میں ایک کارخانہ جہاز تھا جس کے متعلق ملتا ہے کہ شاہجہاں کو اورنگ زیب کے کسی جہاز کے مرمت کرانے سے شکایت پیدا ہوئی کہ وہ شاید ایک نیا جہاز بنوا رہا ہے۔ اور اس پر جو لکڑی خرچ ہو رہی ہے وہ سرکاری ہے جس کی مرمت کے لئے اورنگ زیب نے اپنے لڑکے محمد سلطان کو لکھا کہ اس کی حیثیت کو واضح کرے:۔

"ایشاں جہاز نوی در سورت بندر فرمائش نمودہ اند۔ جہازے کہ در عمل مغل خاں در تتہ تباہی ماندہ بدست زمیندار پرگنہ کلگر الہ افتادہ بود و خالصہ شریفہ تعلق گرفتہ ثانی الحال بصاحب و قبلہ دو جہانی (اورنگ زیب) مرحمت شدہ۔ چوں پیش ازیں چند گاہ آں را با جہاز سلامت رس اور بندر تھتھہ بسورت آوردہ اند۔ و مرمت طلب بود۔ بموجب امر والا مقدسی آنجا بخواست بتعمیر ضروری آں بپردازد۔ اگر ایں معنی مرضی طبع مقدس نباشد۔ مرمت جہاز مذکور کہ بیش از چوب صرف نخواہد داشت موقوف گردد۔" (رقعات عالمگیری ص ۲۲۵، نجیب)

میلے یا مینا بازار

آج ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب و مشرق میں علاوہ بڑی بڑی دوکانوں کے جہاں ملک کی تیار کردہ بہترین اشیاء مل سکتی ہیں نمائشیں بھی لگائی جاتی ہیں جن میں خاص کر مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ خاص طبقہ امراء و رؤسا جو عام طور پر بازار میں خرید و فروخت کے لئے نہیں جاسکتا ملکی صنائع کی ترقی و حوصلہ افزائی کے لئے تشریف لاکر خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اور اس ضمن میں ملکی فنون میں بہت ترقی ہوتی ہے۔ اگر ایسے وسائل اختیار نہ کئے جائیں تو اغلب ہے کہ بعض بہترین صناع یا تو تباہ ہو جائیں یا کوئی ملک پیدا ہی نہ کر سکے کیونکہ بعض صنائع ایسے ہیں کہ عام دوکانوں پر یا بازاروں میں فروخت میں نہیں آتے اس طرح ان کا ملنا ممکن ہوتا ہے۔ ہم روزانہ اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ فلاں جگہ کسی نمائش کا افتتاح ملکہ کے صدر یا گورنر یا کسی بڑے شخص نے کیا اور پھر اس قدر صناع کو انعامات ملے اور ساتھ ہی ان کی اشیا کی خرید بھی ہوئی جو آئندہ کے لئے تمام ترقی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں مغلوں نے بھی اپنے ملک کے صناع کو بہت سے طریق سے حوصلہ افزائی فرمائی جس کی مثال آج دنیا میں کم ہے۔ ان کی عمارات۔ آثارات۔ آلات وغیرہ سب اس امر کے شاہد ہیں کہ فلاں کاریگر نے بنایا اور فلاں داروغہ یا مہتمم کے تحت میں یہ اختتام تک پہنچے۔ جو دستور اب تک قائم ہے۔ پھر اس کے بھی علاوہ ایسی متذکرہ بالا نمائشیں بھی ہوتی تھیں جن کو مینا بازار کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جن کی روایات آج تک بعض حصص ہندوستان میں ملتی ہیں۔ سال یا مہینہ یا ہفتہ میں ایک دفعہ خاص دن کو بازار یعنی ملکی صنعت کی نمائش لگتی ہے۔ جہاں دیگر اضلاع کے صناع اپنی کاریگریاں دکھاتے ہیں اور لوگ ان میں آکر خرید و فروخت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی یادگاریں علیگڈھ کی نمائش۔ نوچندی میرٹھ کی نمائش، مظفر نگر کی نمائش وغیرہ وغیرہ جو اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ میں نے خود ریاست دھار اور اکثر دیگر مقامات پر دیکھا ہے کہ جمعرات کا بازار لگتا ہے جس میں تبادلہ ہوتا ہے گاؤں کے لوگ اپنی اشیا لاتے ہیں اور ان کو فروخت کر کے دیگر ضروری اشیاء اپنے گاؤں کو لے جاتے ہیں چنانچہ متذکرہ اسلوب کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ مغلوں نے مینا بازار قائم کیا ہوا تھا۔ جس کی نہایت عمدہ تفصیل برنیر اپنے سفرنامہ میں بالفاظ ذیل بیان کرتا ہے:

"کبھی کبھی ان جشنوں کے وقت محلسرا میں ایک فرضی بازار بھی لگا کرتا ہے جس میں امراء اور بڑے بڑے منصبداروں کی خوبصورت اور دلربا بیبیاں دوکانیں لگا کر بیٹھتی اور عمدہ کمخاب اور نئی نئی وضع اور عمدہ زردوزی کام کی چیزیں اور زری کا سندھیس اور سفید باریک کپڑے جو امیرزادیوں کے استعمال میں آتے ہیں اور زیادہ بیش قیمت چیزیں فروخت کرنے کو رکھتی ہیں۔ اور بادشاہ اور اس کی بیگمیں اور شاہزادیاں اور عالی رتبہ خاتونیں خریدار بنتی ہیں۔ اور اگر کسی امیر کی بیٹی خوبصورت اور حسین ہوتی ہے تو اس کی ماں ضرور اس کو اپنے ساتھ لیجاتی ہے تاکہ بادشاہ کی نظر پڑ جائے اور بیگمات سے تعارف ہو جائے۔ اس میلہ کا بڑا لطف یہ ہوتا ہے کہ ہنسی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسہ کے لئے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بیگم صاحب بہت گراں فروش ہیں۔ دوسری جگہ سے اس سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے ہم ایک کوڑی بھی زیادہ نہیں دیں گے ادھر

وہ کوشش کرتی ہے کہ اپنا مال زیادہ قیمت کو بیچے اور جب دیکھتی ہے کہ بادشاہ زیادہ قیمت نہیں لگاتا تو گفتگو میں ایسی بڑھ جاتی ہے کہ یہ کہہ اٹھتی ہے کہ آپ اپنے برف بیچنے کی خبر لیں ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں اور آپ کے لائق نہیں۔ بہتر ہے کہ کسی اور جگہ تلاش کریں اور بیگمیں بادشاہ سے بھی زیادہ ارزاں خریدنا چاہتی ہیں غرضیکہ دونوں طرف سے ایسی گفتگو بڑھ جاتی ہے کہ ایک جھگڑے کا سوانگ سا معلوم ہوتا ہے مگر آخر کار سودا طے ہو جاتا ہے اور بادشاہ اور بادشاہزادیاں اور بیگمیں جو چیزیں اِدھر اُدھر سے خریدتی ہیں ان کی قیمت فوراً دیدیتی ہیں اور روپیوں کی جگہ اشرفیاں اس طور سے ہاتھ سے ڈال دیتی ہیں کہ گویا دوکاندار یا اس کی بیٹی کے حسن و جمال نے ان کو ایسا محو کر دیا ہے کہ روپیوں یا اشرفیوں میں تمیز ہی نہیں رہی اور ویسی ہی بے پروائی سے دوکاندار ان کو اٹھا لیتی ہے [1]

کھانوں کے متعلّق

ایک رقعہ میں بنام فرزندیوں بیان کرتا ہے جس سے اس کا ذوق خوراک واضح ہے اور اس فن کے ماہرین سے بھی خوب واقف ہے :-

"فرزند عالیجاہ مزہ کھچری بریانی شما در زمستاں بیاد مے آید الحق کہ قبولی اسلام خان آں قبولی نمیرسد میخواستم کہ سلیمان بریانی پزرا از شما بگیرم اما شفقت پدری اقتضا نکرد اگر از شاگردان او کسی مہارت ایں فن داشتہ شد طلبیدہ آید والا خوشا روزی کہ بیاید و بخورند و بخورانند ؎

خوشا وقتی و حرم روزگاری — کہ یاری برخوردار از وصل یاری
بہوس از سرم یکسر مو نرفت — سیاہی ز مو رفت واز رو نرفت

---

[1] سفرنامہ ص ۲۹۲-۵/۲

DEPARTMENT OF ... LIBRARY ...

نتیجہ

اورنگزیب عالمگیر کے طویل عہد حکومت (۱۰۶۸ھ - ۱۱۱۸ھ) سے متعلق زندگی کے کسی پہلو کو بھی کماحقہ پیش کرنے کے لئے بہت ضخیم کتاب کی ضرورت ہے کیونکہ جس قدر یہ طویل عہد ہے اسی قدر اس کے متعلق مختلف الرائے بیانات ملتے ہیں پھر خاص کر اس موضوع فنون کے تحت ان سے متعلق تمام عہد کی تحریروں سے تلاش کرنا ایک دشوار امر تھا جس کے بعد ان پر صاحب بصیرت کے لئے کماحقہ تبصرہ کرنا بھی اسی قدر مشکل امر تھا تاہم مختصر طور پر ان متذکرہ بالا صفحات میں فنون کے ضمن میں ہر پہلو کو پیش کرنے کی ایک کوشش ضرور کی گئی ہے۔ باقی رہا ان میں کامیابی ہوئی کہ نہیں یہ ناظرین اور قارئین کرام کتاب کی رائے پر ہے۔ یہ بھی ضرور ہے کہ آج تک کبھی کسی نے اس ضمن میں توجہ بھی نہیں کی۔ غرضیکہ ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر یہاں مواد کو جمع کیا گیا ہے اور کسی قدر بعض مقام پر اپنے اجتہاد سے بھی کام لیا گیا ہے جو لازمی تھا۔

میں پھر اس امر کا اعادہ کروں گا کہ اورنگ زیب کے عہد کو پیوریٹن ازم (PURITANISM) سے تطبیق دے کر مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس شاہنشاہ کے گرد محور کرتا نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی وہ بذات خود شخصی طور پر فنون کے حظ سے معرا بھی نہیں ہے اور ان کے ہر پہلو کا پورا ادراک بھی رکھتا ہے جیسا کہ ہر شعبہ میں نظر آتا ہے جب وہ اپنے بچوں کو خط لکھتا ہے تو اس میں صاف ہدایت کرتا ہے کہ "شکار بیکاروں کا کام ہے انسان اگر عاقبت کے کاموں میں مصروف نہیں ہو سکتا تو دنیا کے کام سنوارنے میں کیا برائی ہے کیونکہ "الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" دنیا آخرت کی کھیتی ہے یعنی انسان کا دنیا میں ایک مقصد ہے اور انسان کو سرور و نفع کے کاموں سے لگاؤ بھی رکھنا چاہیئے۔ اس کے روزمرہ کے تقسیم اوقات پر نظر بھی کرنی چاہیئے جو اس کے عہد کے مؤرخین نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس سے وہ صحیح طور پر آئینہ میں نظر آئیگا اور اس کا جمالیاتی پہلو بھی الگ سامنے آجائیگا۔ غرضیکہ یہ ایک کوشش ضرور ہے جو انتہائی معذرت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

محمد عبداللہ چغتائی